مفتی اور مستفتی کے لئے

فتویٰ کے آداب



تالیف

ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی رحمہ اللہ

(۶۳۱ھ - ۶۸۶ھ)

تقدیم

استاذ العلماء مفتی جماعت اہلحدیث حافظ عبدالوہاب روپڑی حفظہ اللہ

خریج اُم القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ

مترجم

قاری أبو أسید إدریس العاصم

خریج جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

نظرثانی

قاری أبو بکر العاصم

خطیب مسجد الھدیٰ (امریکہ)

مفتی اور مستفتی کے لئے

فتویٰ کے آداب



تالیف

ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی
(۶۳۱ھ - ۶۷۶ھ)

تقدیم

مفتی جماعت اہلحدیث اسوۃ العلماء حافظ عبدالوہاب روپڑی حفظہ اللہ

خریج اُم القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ

مترجم

قاری اُم بسیر ادریس العاصم

خریج جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

نظر ثانی

قاری أبوبکر العاصم

خطیب مسجد الہدیٰ (امریکہ)

نام کتاب * آدابِ فتوی، مُفتی اور مستفتی
تالیف * ابوزکریا یحیٰ بن شرف النووی الدمشقی
ترجمہ وترتیب * قاری اویس ادریس العاصم
نظر ثانی * قاری ابوبکر العاصم
کمپوزنگ * مسز قاری اویس ادریس العاصم
ڈیزائننگ * عبید الرحمٰن عقابی
تعداد * 1100
سائز * 5.5"X 8.5"
صفحات * 80
اشاعت اول * 8 جماد الثانی، 1445ھ، دسمبر 2023ء
مدرسہ تعلیم القرآن والسنہ للبنات، مکان نمبر 22، گلی نمبر 3، محلہ
حبیب گنج، مصری شاہ لاہور
موبائل نمبر: 03227776945

فہرست

پیش لفظ

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ. امابعد:

اللہ تعالیٰ کا کروڑہا فضل واحسان ہے کہ اُس نے مجھے اس کتاب کی نظر ثانی کی توفیق عطا فرمائی۔ "آدابِ فتویٰ، مفتی اور مستفتی" ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی کی بہت ہی عمدہ کتاب ہے، جس کا ترجمہ برادرِ اصغر قاری اویس ادریس العاصم حفظہ اللہ نے ڈاکٹر اکرم ہریری اور پروفیسر نصر اللہ خالد کی خواہش پر کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ مفتی جماعت الحدیث، استاذ العلماء، فضیلۃ الشیخ حافظ عبدالوھاب روپڑی حفظہ اللہ نے تحریر کیا ہے۔ فتویٰ کی ضرورت واہمیت اُتنی ہی قدیم ہے جتنا انسان خود ہے۔ انبیاء کرام اپنی اپنی امت کی شرعی رہنمائی کرتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ پر رسالت کے اختتام پذیر ہونے کے بعد فتویٰ کی ذمہ داری راسخ العلم علماء کے سپرد ہو گئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۷)

"اور (اے حبیب مکرم ﷺ!) ہم نے آپ سے پہلے (بھی) مردوں ہی کو (رسول بنا کر) بھیجا تھا۔ ہم اُن کی طرف وحی بھیجا کرتے تھے (لوگو!) تم اہل ذکر سے پوچھ لیا کرو، اگر تم (خود) نہ جانتے ہو۔"

ایک طرف عامۃ الناس کو اہل علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو دوسری طرف علماء کو علم کی بات چھپانے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أَلْجَمَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (مسند أحمد: ۸۵۳۳ واللفظ له، أبو داود: ۳۶۵۸)

"جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے چھپائی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اُسے آگ کی لگام پہنائے گا۔"

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود اپنی زندگی میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دوسرے علاقوں میں بھیجا تو اس بات کا اہتمام کیا کہ وہاں جا کر وہ لوگوں کے شرعی مسائل کا حل سمجھائیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب انہیں یمن کی طرف بھیجا تو ان سے پوچھا کہ اگر تمہارے پاس کوئی فیصلہ آیا تو تم اسے کیسے حل کرو گے؟ عرض کیا کہ کتاب اللہ کی روشنی میں اس کا فیصلہ کروں گا، نبی کریم ﷺ نے پوچھا: اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو کیا کرو گے؟ عرض کیا: پھر نبی کریم ﷺ کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا، نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ اگر اس کا حکم میری سنت میں بھی نہ ملا تو کیا کرو گے؟ عرض کیا کہ:

أجتهِدُ رَأيي ولا آلو، قال: فضَرَبَ صَدري فقال: الحَمدُ للهِ الذي وَفَّقَ رسولَ رسولِ اللهِ ﷺ لما يرضي رسولَه.

"میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کروں گا، اس پر نبی کریم ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے سینے پر مار کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے پیغمبر کے قاصد کی اس چیز کی طرف رہنمائی فرمادی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔" (مسند أحمد: ۲۲۱۰۰ واللفظ له، أبو داود: ۳۵۹۳)

ہمارے معاشرے میں عجیب قسم کی وبا چل پڑی ہے کہ کوئی شخص اگر کسی امام صاحب سے سوال کرتا ہے تو پاس بیٹھے عام لوگ (سائلین) فوراً جواب دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہ وتیرہ سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ کتاب علماء کرام اور عامۃ الناس کے لیے یکساں مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک ہدایت دے اور اس کتاب کا مطالعہ کرکے اس نازک موضوع کی اہمیت کو سمجھنے کی کو توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ اُن سب لوگوں کو بھی بہترین

جزائے خیر سے نوازے جو اس کارِ خیر میں شامل رہے۔ اللہ رب العزت اسے ہمارے لیے اور ہمارے والدین کے لیے توشہ آخرت بنائے۔ آمین۔

قاری ابوبکر عاصم
خطیب مسجد الھدیٰ، امریکہ

عرضِ مترجم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علی آلہ وصحبہ أجمعین.

فتویٰ نویسی انتہائی ذمہ دارانہ کام ہے جس کی اہمیت اس طرح واضح ہوتی ہے کہ یہ جلیل القدر صحابہ کرامؓ اور و تابعین عظامؒ کا بھی مشغلہ رہا ہے، مگر فتویٰ دینا نہایت ہی نازک معاملہ ہے۔ اس لیے یہ بہت زیادہ احتیاط کا متقاضی ہے، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((من افتی بغیر علم فهو علی من افتاه)) (ابو داود: 3657)

"جو بغیر علم کے فتویٰ دے اس کا گناہ اسی مفتی پر ہے۔"

فتویٰ نویسی کے اصول وآداب اور علومِ شریعت سے واقف ہونا اور شروطِ افتاء کا جاننا ایک مفتی کے لیے بے حد ضروری ہے، تاکہ وہ آپ ﷺ کی حدیث "فضلوا وأضلوا" کا مصداق نہ بن جائے اور امت کا اعتماد افتاء کے حامل افراد پر بحال رہے اور ہر فیصلہ کو امت بہ سر و چشم قبول کرے۔ موجودہ دور میں لفظ "افتاء وفتوی" نے بھی اپنا تقدس واہمیت کھودی ہے، جس کی وجہ سے عام افراد کے ساتھ ساتھ علماء کا اعتماد بھی مفتیان کرام سے اٹھتا جارہا ہے۔ اسلام کے متبعین کی نظر میں دارالافتاء کے فیصلے اپنی وقعت کھوتے جارہے ہیں۔

نئے فارغ التحصیل علماء جنہوں نے اپنی طالب علمی کی زندگی لہو ولعب، اور لاپروائی میں گزاردی۔ اور اپنے وقت کی قدر نہ کی، وہ محض ایک، دوسالہ افتاء کورس کرکے خود کو اس قابل سمجھنا شروع ہوجاتے ہیں کہ دینی مسائل میں اپنی ذاتی آراء پیش کرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مقدس شعبے کی اہمیت روز بروز کم ہورہی ہے، قابل قدر مفتیان کرام کا عزت ووقار بھی مجروح ہورہا ہے، اور امت کا دار الافتاء سے اعتماد آہستہ آہستہ کم ہوتا جارہا ہے اور امت بھی بے راہ روی کا شکار ہورہی ہے۔

اس موضوع کی نزاکت اور اہمیت وضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ کتاب کا ترجمہ کرنے لیے جناب پروفیسر نصر اللہ خالد صاحب، ڈاکٹر اکرم ہریری صاحب بار بار ترغیب دلاتے رہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ونصرت سے یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ برادرِ اکبر قاری ابوبکر العاصم صاحب نے اس کتاب کی اشاعت کے لیے بھرپور تعاون کیا۔ اللہ تعالیٰ تمام معاونین کو جزائے خیر سے نوازے، اور اس کارِ خیر کو سب کے لیے توشہ آخرت بنائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس منصب کی حساسیت ونزاکت سمجھ کر امت کی درست رہنمائی کی توفیق دے اور صحابہ وسلف صالحین کا فہم اپنانے کی توفیق دے۔ آمین۔

مفتی قاری اویس ادریس العاصم

مدیر التعلیم

المدرسہ العالیہ تجوید القرآن

15-12-2023

عفی اللہ عنہ وعن والدیہ

ابتدائیہ

إنّ الحمد لله ، نحمده ونستعينه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور أنفسنا وسيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضلّ له ومن يُضلله فلا هادي له، وأشهد أن لا إله الاّ الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله صلّى الله عليه وسلّم تسليما مزيدا، أمّا بعد!

قرآن و حدیث اور سیرت صحابہ کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فتویٰ دینا اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور سلف صالحین و آئمہ دین کا طریقہ ہے۔ قرآن مجید میں "استفتاء" اور "افتاء" دونوں کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ • قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ• "اور لوگ آپ سے (یتیم) عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجیے: اللہ تعالیٰ تمہیں اُن کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔" (النساء:127) اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا: يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ "لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجیے: اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔" (النساء:176)

فتویٰ کی تعریف:

کسی چیز کے لیے کوئی معاملہ واضح کرنا اور دو ٹوک رائے دینا لغوی طور پر فتویٰ کہلاتا ہے۔ جیسے لغت عرب کی مستند کتب الصحاح، القاموس، المحیط اور لسان العرب میں وضاحت موجود ہے۔

امام راغب بیان کرتے ہیں کہ فتویٰ مشکل احکام میں صادر ہونے والے جواب کو کہتے ہیں۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ تو نے اُس سے سوال کیا تو اس نے تجھے فتویٰ (جواب) دیا۔ (مفردات القرآن، ص 373)

اصطلاحی تعریف:

کسی وضاحت طلب مسئلہ میں اس موضوع کے متعلق خصوصی اہلیت کے حامل فقیہ، مجتہد عالم کی طرف سے جاری کردہ حکم، رائے، فیصلے اور وضاحت کی نص اور بیان جو کہ سائل کے جواب میں صادر ہو، فتویٰ کہلاتا ہے۔

جن مسائل، احکام اور اشکالات کے متعلق صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے سوالات دریافت کیے اور آپ ﷺ کی طرف سے ارشاد کردہ جوابات "فتاوی رسول" کہلاتے ہیں، جو کتب احادیث میں بہ کثرت موجود ہیں لیکن عہد رسالت میں عموماً زبانی فتویٰ پر اکتفا کیا جاتا رہا۔ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فتاوی بھی کثرت کے ساتھ کتب سیر اور تاریخ میں موجود ہیں جیسا کہ بعض صحابہ کرام کو اسی بنا پر امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ عہد صحابہ میں فتوی دونوں طرح (زبانی اور کتابت کی شکل میں) دیا جاتا تھا۔ بعدازاں کتاب و سنت کی جمع و تدوین کے ساتھ اُن کے متعلقہ دوسرے علوم مثلاً فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث و تفسیر اور نحو و صرف وغیرہ میں بھی مسلسل ترقی ہوتی رہی تو افتاء نے بھی ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ علمائے اُمت کے فتاویٰ کو کتابی شکل میں شائع کیا جانے لگا اور ساتھ اصول و ضوابط بھی وضع کیے گئے تاکہ اُن کی روشنی میں اہل اسلام کو درکار رہ نمائی میسر آسکے۔ اِس ضرورت کو مفتیانِ کرام نے محنت شاقہ اور سعی جمیلہ کے ذریعے بحسن طریق پورا کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

فتوی نویسی کے میدان میں بڑے بڑے شاہسوار اُترے۔ سب نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق گراں قدر یادگار خدمات سرانجام دیں جن کے مجموعے کتابی شکل میں موجود ہیں۔ جیسا کہ فتاویٰ مجموعہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، الفتح الربانی فتاویٰ الامام شوکانی، فتاویٰ الشیخ محمد بن ابراہیم، فتاویٰ صالح بن فوزان، فتاویٰ ابن عثیمین، فتاویٰ البلد الحرام، فتاویٰ اسلامیہ، مختار الفتاویٰ ابن قیم، فتاویٰ ہیئۃ کبار العلماء، عون القدیر فتاویٰ محمد بن اسماعیل الامیر، فتاویٰ المعاصرۃ، فتاوی الامام نووی، فتاویٰ اہل حدیث، فتاویٰ محمدیہ، فتاویٰ ثنائیہ

مدنیہ، فتاویٰ عثمانی، فتاویٰ نوریہ، احسن الفتاویٰ، منہاج الفتاویٰ، فتاویٰ اصحاب الحدیث، فتاوی عالمگیری، فتاویٰ ثنائیہ، فتاویٰ حصاریہ، فتاوی قاضی خان، فتاوی عزیزیہ، فتاویٰ نذریہ، فتاوی رضویہ، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ آپ کے مسائل اور اُن کا حل وغیرہ۔

فتویٰ کے فوائد:

فتویٰ اگر مقاصد شریعت اور روح اسلام، کتاب وسنت کے دلائل، سلف وصالحین کے علمی منہج، اصول کے مطابق و شخصی گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر ضعیف ادلہ، شاذ اقوال سے ہٹ کر محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور لوگوں کی اصلاح کے لیے جاری کیا جائے تو اِس سے بہت زیادہ معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں: (1) اُمت سے اختلاف وانتشار کی بیخ کنی ہوتی ہے (2) دین اسلام کے متعلق لاعلمی وجہالت کا خاتمہ ہوتا ہے (3) اُمت کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے (4) اُمت اور علماء کے درمیان رابطے کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے (5) طالب حق کے لیے فہم وبصیرت کے دروازے کھلتے ہیں (6) دینی فرائض کی بجاآوری میں بہترین معاون ثابت ہوتا ہے (7) سنت کے احیاء اور بدعات کے قلع قمع کا باعث بنتا ہے۔

غلط فتویٰ کے علمی ودینی نقصانات:

اگر فتویٰ میں مقاصد شریعت، کتاب وسنت کے دلائل اور سلف صالحین کے منہج کو نظر انداز کر دیا جائے، اُس کا انحصار ضعیف ادلہ اور شاذ اقوال پر ہو اور لوگوں کی رضا مندی مقصود ہو تو پھر اُس کے بہت سارے دینی وعلمی نقصانات ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں: (1) فتویٰ کے نام پر حدود اللہ کی پامالی کی جاتی ہے (2) شرعی احکامات سے ٹال مٹول کرنے کی جاہلانہ جرأت جنم لیتی ہے (3) حق کے لبادے میں باطل کی نشرواشاعت ہوتی ہے (4) اُمت صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے (5) علمائے حق سے نفرت اور دوری پیدا ہوتی ہے (6) اُمت میں انتشار جنم لیتا ہے (7) فہم وبصیرت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

ہر دور میں بعض علماء اِس فن کے متعلق اپنی معروضات پیش کیں جس میں انھوں نے افتاء، مفتی اور مستفتی کے آداب بیان کیے تاکہ مستفتی اور مفتی افراط و تفریط سے اجتناب کریں۔ اُن میں سے ایک ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی ہیں۔ اُن کی کتاب "آداب فتویٰ والمفتی والمستفتی" بڑی اہمیت کی حامل ہے جس میں اُنھوں نے بڑی حد تک لوگوں کی علمی تشنگی دور کرتے ہوئے اِس فن میں راہ نمائی فرمائی ہے۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب ایک انفرادی حیثیت کی حامل بھی ہے جس میں فتویٰ نویسی کے اصول وضوابط بتلا کر اُس کے متعلقہ ایسی اشیاء کی وضاحت کی گئی جن کی رعایت رکھنا فریقین کے لیے ہر وقت ضروری ہوتا ہے۔

فتویٰ نویسی کے اصول وضوابط:

انھوں نے فتویٰ نویسی کے درج ذیل اصول بیان کیے ہیں:

(1) مفتی کو چاہیے کہ شرعی دلیل کے بغیر کوئی بات نہ کرے، بصورت دیگر وہ اللہ تعالیٰ پر افترا اور رسول اللہ ﷺ کے ذمے جھوٹے لگانے والا ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ "اور اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا اور اُس کی آیات کو جھٹلایا، یقیناً ظالم لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے۔" (الأنعام:21)

سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ "جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا اُسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔" (صحیح بخاری:1291)

(2) تمرینِ فتویٰ: مفتی درج ذیل چیزوں کا خیال رکھے: (1) جواب واضح، سوال کے عین مطابق، مدلل اور عام فہم ہو (2) سوال اور جواب میں کوئی ابہام نہ ہو (3) سوال جواب دینے کے قابل ہو کیونکہ بعض سوالات جواب دینے کے قابل نہیں ہوتے جیسے فتنہ انگیزی، مفتی کو لایعنی بحثوں میں مشغول کرنے، کسی پر کیچڑ اُچھالنے، مفتی کا امتحان لینے

کی غرض سے، کسی شخصیت یا ادارے کے متعلق کیے گئے سوال کا جواب فریقین سے تحقیق کیے بغیر جواب دینا وغیرہ۔

(3) سوال کا جواب معیاری ہو: معیاری جواب درج ذیل اوصاف پر مشتمل ہوتا ہے (1) جواب دیتے وقت مبہم الفاظ سے گریز کرنا (2) جواب کا سائل کو مطلوب تمام تر امور کی وضاحت پر مشتمل ہونا (3) جواب دیتے وقت بے جا طوالت سے احتراز کرنا (4) شرح صدر نہ ہونے کی صورت میں اہل علم سے مشاورت کرنا (5) جواب کا ادلہ شرعیہ اور اقوالِ سلف سے مزین ہونا (6) جواب دیتے وقت افراط و تفریط اور جمود سے بچتے ہوئے راہِ اعتدال اختیار کرنا (7) مسلکی تعصب کو پس پشت ڈال کر نصوص شرعیہ سے ثابت ہونے والے موقف کو بخوشی اُجاگر کرنا وغیرہ۔

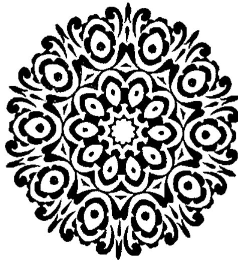
مؤلف نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں فتویٰ کی اہمیت، فضیلت اور خطرات پر بحث کرنے کے بعد اِس موضوع پر تین فصلیں قائم کیں۔ جن میں مفتی کا متقی وپرہیز گار، ہونا اور اُس کی شروط بیان کرنے کے ساتھ اِس امر کی وضاحت کی کہ فتویٰ دینے کا اہل کون ہے؟ پھر مستقل اور غیر مستقل کے عنوان سے فصل قائم کر کے مفتیوں کی اقسام اور اُن کے احوال بیان کیے ہیں۔ اِس کتاب کا موضوع صرف دینی احکام سے متعلق فتاویٰ جات ہی نہیں بلکہ سائل اور مسئول دونوں ہی ہر مسئلے میں اس کتاب کے محتاج ہیں۔ موجودہ دور میں ہر وہ آدمی جسے لوگوں کے سوال و جواب دینے پڑتے ہیں اِس کتاب کا محتاج ہے کیوں کہ اِس کے مطالعہ سے وہ احسن انداز کے ساتھ جواب دینا سیکھ لیتا ہے۔

یقیناً ایک مؤلف بھی اِس کے بعض اساسی قواعد سے مستفید ہو کر اپنی تحریر کو طوالت سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے موضوع میں منفرد ہونے کے ساتھ مؤلف اور مترجم مفتی قاری اویس ادریس العاصم حفظہ اللہ کے لیے بہترین صدقہ

جاریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی ہر نیکی میں اُن کے والدین کو حصہ دار بنائے اور اُن کی بقیہ زندگی بھی اپنے دین حنیف کی خدمت کے لیے قبول فرمائے۔ آمین۔

بقلم

حافظ عبدالوہاب روپڑی عفی عنہ
خریج جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسّلام على سيّدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين، أما بعد؛

کتاب " آداب الفتوى، والمفتي والمستفتي"، امام الفقہاء والمحدثین، شیخ الاسلام ابوزکریا یحیی بن ابی یحیی شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام الحزامی النووی الحورانی الدمشقی رحمہ اللہ کی شاہکار تصنیف ہے۔

امام نوویؒ محرم الحرام کے درمیانے عشرے اور ایک قول کے مطابق پہلے عشرے سنہ ۶۳۱ھ میں "نویٰ" میں پیدا ہوئے، یہ دمشق (شام) کے جنوبی علاقے حوران کی ایک بستی ہے۔

آپؒ سنہ ۶۴۹ھ میں دمشق آئے اور وہاں کے شیوخ سے علم حاصل کیا، جلد ہی علم و ورع کے اعتبار سے آپ کا شمار وہاں کے کبار علماء میں ہونے لگا۔

آپ کی پچاس سے زائد تصانیف ہیں، جنہیں کمال شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، بلکہ "ریاض الصالحین اور الأذکار" جیسی آپ کی بعض تصانیف کو تو نسخ و طباعت کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ شہرت ملی۔

۲۴ رجب سنہ ۶۷۶ھ کو آپ نے وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالی۔

☆ ☆ ☆

امام شمس محمد بن عبد الرحمن بن محمد السخاویؒ (ت: ۹۰۲ھ) کی کتاب "الاھتمام بترجمة الامام النووی شیخ الاسلام"[1] پر کام کے دوران مجھ پر عیاں ہوا کہ مصنف نے امام نووی کی متعدد ایسی کتب کا تذکرہ بھی کیا ہے جن میں امام نووی نے اپنی یا کسی اور کی

---

1 امام نوویؒ کے حالات زندگی پر یہ سب سے جامع ترین کتاب ہے، جس میں مصنف نے امام نووی سے متعلق سابقہ تمام مترجمین کے اقوال نقل کیے ہیں۔

کتاب کی تلخیص کی ہے یا ایک موضوع کی متعدد کتب کی یکجا تلخیص کی ہے، اسی تیسری قسم میں سے آپؒ کی ایک کتاب "أدب الفتوی والمفتي والمستفتي" ہے جس میں امام نوویؒ نے ایک موضوع کی تمام معلوم کتابوں کی تلخیص کر دی ہے، اس کتاب میں درج ذیل مصنفین کی کتب کی تلخیص کی گئی ہے:

- کتاب أبي القاسم الصیمری۔
- کتاب أبي بکر الخطیب البغدادی۔
- کتاب أبي عمرو ابن الصلاح۔

ان تینوں أعلام کا مختصر تعارف ملاحظہ ہو:

امام ابو القاسم الصیمریؒ کا تعارف:

عبد الواحد بن حسین بن محمد القاضی، ابو القاسم الصیمری، شوافع کے ائمہ و شیوخ اور علماء میں سے ہیں، آپ اصحاب الوجوہ[1] میں سے تھے۔ آپؒ مذہب شافعی کے محافظ بہترین مصنف تھے۔

الصَّیمَرِی: صاد پر فتحہ، یاء ساکن کے بعد میم مفتوح اور پھر راء ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ ضبط ہی صحیح اور مشہور ہے، ابن باطیش نے بھی میم پر فتحہ ذکر کیا ہے، بعض لوگوں نے میم پر ضمہ پڑھا ہے، جیسے کہ حازمی کے بعض شاگردوں نے مجھے ان سے بیان کیا ہے۔

ابن باطیش کہتے ہیں: یہ ولایت خوزستان کے اطراف میں واقع ایک قدیم شہر صیمرہ کی طرف نسبت ہے، یہ گنجان آباد علاقہ تھا جہاں پر منبر اور جامع مسجد بھی تھی۔

---

1 اصحاب الوجوہ کا درجہ مجتہد فی المذہب اور مجتہد مطلق منتسب کے درمیان ہے۔

ابو الفرج ابن الجوزی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: الصیمری صیمر کی طرف نسبت ہے؛ یہ بصرہ میں ایک مشہور نہر کا نام ہے جس پر بہت ساری بستیاں آباد ہیں۔

امام نوویؒ ابن باطیش کے بعد ابن الجوزی کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: یہی بات زیادہ بہتر ہے، کیونکہ الصیمری بصری بھی ہیں۔

امام سُبکیؒ فرماتے ہیں: الصیمری: میرے خیال میں یہ بصرہ کی کسی نہر کی طرف نسبت ہے، جسے الصیمر کہا جاتا ہے، اس پر متعدد بستیاں آباد ہیں، اور الصیمرہ، دیار الجبل اور خوزستان کے درمیان ایک علاقہ ہے، میرا نہیں خیال کہ الصیمری اس علاقے کی طرف نسبت ہے۔

الصیمریؒ بصرہ میں آئے اور ابو حامد أحمد بن بشیر بن عامر العامریؒ المروروذیؒ (ت: ۳۶۲ھ) اور ابو حامد المروروذیؒ کے شاگرد ابوالفیاض محمد بن الحسن بن منتصر البصریؒ (ت: حدود سنہ ۳۸۵ھ) سے فقہ سیکھی۔

اسی طرح قاضی القضاۃ ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردیؒ (ت: ۴۵۰ھ) نے امام صیمریؒ سے علم فقہ حاصل کیا۔

امام صیمریؒ کی متعدد کتب ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1. "أدب المفتي والمستفتي"، بقول امام سُبکی یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔
2. "الإیضاح فی المذھب"، اس کی بابت امام نوویؒ فرماتے ہیں: یہ بہت عمدہ اور کثیر الفوائد کتاب ہے، لیکن ہے بہت نایاب، بقول امام ذہبیؒ یہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔
3. کتاب فی الشروط۔
4. کتاب فی القیاس والعِلَل۔

5. کتاب "الکفایۃ"، امام اِسنوی کے بقول انہوں نے خود ہی اس کی شرح بھی کی ہے، یہ بات انہوں نے صاحب "الاستقصاء" اور ابن الصلاح سے نقل کی ہے۔

امام سبکیؒ فرماتے ہیں: امام صیمریؒ نے سنہ (۳۸۶ھ) کے بعد وفات پائی۔[1]

"سیر أعلام النبلاء" میں امام ذھبیؒ نے نقل کیا ہے: کہ امام صیمریؒ نے سنہ ۳۸۷ھ میں اپنی بعض کتب پڑھائیں۔[2]

پھر اسی جزء میں ابو عبداللہ الحاکم (ت:۴۰۵ھ) کے ترجمے کے بعد فرماتے ہیں: اسی سال بصرہ میں شیخ الشافعیہ: ابوالقاسم عبدالواحد بن الحسین الصیمریؒ نے وفات پائی۔[3]

امام اِسنویؒ[4] نے امام ذھبیؒ سے نقل کیا ہے: کہ امام صیمری سنہ ۴۰۵ھ میں موجود تھے۔

مصادرِ ترجمہ:

"طبقات الفقهاء" الشيرازى:١٢٥ ، "معجم البلدان" ٣/٤٣٩، ماده: صَيمَرة، "تهذيب الأسماء واللّغات" ٢/٢٦٥، "عيون التواريخ" ١٢/٢٦١ "سير أعلام النبلاء" ١٧/١٤ و١٧٧، "طبقات الشافعيه" إسنوى، ٢/١٢٧، ١٢٨ ، "طبقات الشافعيه" ابن هدايةالله:١٢٩، ١٣٠، "هدية العارفين " ١/٤٣٣۔

---

1 "طبقات الشافعیۃ" للسبکی (۳/۳۳۹)۔

2 "سیر أعلام النبلاء" (۱۷/۱۵)۔

3 "سیر أعلام النبلاء" (۱۷/۱۷۷)۔

4 "طبقات الشافعیۃ" (۲/۱۲۸)۔

تعارف خطیب بغدادیؒ:

ابو بکر احمد بن أبي الحسن علي بن ثابت بن أحمد بن مهدي الخطيب البغدادي۔

آپؒ ۲۴ جمادی الآخر سنہ ۳۹۲ھ کو پیدا ہوئے، جنوب مغربی بغداد میں دریائے دجلہ پر واقع درزیجان بستی میں آپ نے نشوونما پائی، آپ کے والد محترم بیس سال تک وہاں کی جامع مسجد کے خطیب و امام تھے۔

بچپن سے ہی خطیب بغدادیؒ کو والد کی طرف سے بڑی شفقت و عنایت نصیب ہوئی، وہ آپ کو کبار علماء کی خدمت میں لے کر جاتے، جن سے خطیب بغدادیؒ نے پڑھا اور علم سیکھا۔

عمر کے گیارہویں سال آپؒ نے بغداد میں حدیث کا سماع کیا اور وہاں پر وارد ہونے والے علماء و مشایخ سے خوب استفادہ کیا، آپ نے بیس سال کی عمر میں بصرہ کا سفر کیا، ۲۳ سال میں نیشاپور اور بڑھاپے میں مکہ و شام وغیرہ کے سفر کیے۔

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: آپؒ نے کتنے ہی علوم لکھے اور جمع کیے، کتنی ہی کتب کی تصحیح و تشریح کی، علم جرح و تعدیل اور تاریخ میں آپ کی خدمات نمایاں ہیں، خطیب بغدادیؒ علی الاِطلاق اپنے زمانے میں علوم کے سب سے بڑے حافظ تھے۔

آپؒ کی تصنیفات ساٹھ سے زائد ہیں، جنہیں اکثر مترجمین نے ذکر کیا ہے، لیکن آپ کی کتاب "آداب الفتوی والمفتي والمستفتي" سے اکثر مترجمین بے خبر رہے۔

خطیب بغدادیؒ نے بروز سوموار سات ذی الحجہ سنہ ۴۶۳ھ میں وفات پائی، اور باب حرب بغداد قبرستان میں بشر الحافی کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

مصادرِ ترجمہ:

"الأنساب" ۱۵۱/۵، "تبيين كذب المفتري" ۲۶۸–۲۷۱، "فهرست ابن خير" ۱۸۱ – ۱۸۲ "المنتظم" ۲۶۵/۸ – ۲۷۰ ، "معجم الأدباء" ۱۳/۴ ۴۵۰، "اللباب" ۴۵۳/۱–۴۵۴، "الكامل في التاريخ" ۱۰/

۶۸، "وفیات الاعیان" ۱/ ۹۲-۹۳، "المختصر فی أخبار البشر" ۲/ ۱۸۷، "العبر" ۳/ ۲۵۳، "سیر أعلام النبلاء" ۱۸/ ۲۷۰، "المستفاد من ذیل تاریخ بغداد" ۵۴، "تتمۃ المختصر" ۱/ ۵۶۴، "الوافی بالوفیات" ۷/ ۱۹۰-۱۹۹، "مرآۃ الجنان" ۳/ ۸۷، "طبقات الشافعیۃ" للسبکی ۴/ ۲۹-۳۹، "طبقات الشافعیۃ" للإسنوی" ۱/ ۲۰۱-۲۰۳، "البدایۃ والنہایۃ" ۱۲/ ۱۰۱-۱۰۳، "النجوم الزاهرة" ۵/ ۸۷-۸۸، "طبقات الحفاظ" للسیوطی": ۴۳۴-۴۳۶، "تاریخ الخمیس" ۲/ ۳۵۸، "طبقات الشافعیۃ" لابن ہدایۃ اللہ": ۱۶۴-۱۶۶، "شذرات الذہب" ۳/ ۳۱۱-۳۱۲، "روضات الجنات" ۷۸-۷۹، "الرسالۃ المستطرفۃ" ۵۲، "التنکیل بما فی تأنیب الکوثری من الأباطیل" للمعلمی" ۱۲۶-۱۵۷، "الخطیب البغدادی" للدکتور یوسف العش"، "موارد الخطیب البغدادی فی تاریخ بغداد" للدکتور ضیاء العمری۔

تعارف ابو عمرو ابن الصلاح:

ابو عمرو تقی الدین عثمان بن صلاح الدین بن عبد الرحمن بن عثمان بن موسی الکردی الشہرزوری الشرخانی الموصلی الشافعی، متعدد علوم میں ماہر محدث، حُجت، فقیہ اور اُصولی تھے۔

سنہ ۵۷۷ھ میں شرخان میں پیدا ہوئے؛ یہ اِربل کے زیرِ اثر شہر زور کے قریب شمالی عراق میں ایک بستی ہے، اسی کی طرف ان کو منسوب کیا جاتا ہے، لیکن ان کی نسبت شہر زور اور ان کے باپ کی طرف (یعنی ابن الصلاح) زیادہ مشہور ہوئی۔

شہر زور میں آپؒ نے نشوونما پائی اور فقہ پڑھی، پھر موصل میں اور اس کے بعد بلادِ اسلامیہ کی طرف طلب علم کے لیے رختِ سفر باندھا، چنانچہ آپؒ نے بغداد، بلادِ خراسان اور بلاد شام کی طرف سفر کیا، دمشق میں اقامت بھی اختیار کی، اور رواحیہ، دارالحدیث النوریہ، اور الشامیہ الجوّانیہ میں تدریس بھی کی۔

ان کے شاگرد ابن خلکان ان کے متعلق رقمطراز ہیں: تفسیر، حدیث، فقہ، اسماء الرجال، علوم الحدیث اور علم اللغۃ میں اپنے دور کے سب سے بڑے عالم تھے، آپ متعدد فنون و فتاوی جات میں بھی پیش پیش رہے۔

ابن الصلاحؒ نے سنہ ۶۴۳ھ میں وفات پائی اور الصوفیہ قبرستان میں مدفون ہوئے، جامعہ السوریہ کی عمارات کے احاطے میں ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔

ان کی کتاب "أدب المفتي والمستفتي" مطبوع ہے، جس کی پہلے عراق میں دکتور محی الدین السرحان نے تحقیق کی تھی، پھر مصر میں عبدالمعطی القلعجی نے کی۔

مصادرِ ترجمہ:

"مرأة الزمان" لسبط ابن الجوزي ۸/۷۵۷-۷۵۸، "ذيل الروضتين: لأبي شامة ۱۷۵، "وفيات الأعيان" لابن خلكان ۳/۲۴۳ – ۲۴۵، الترجمة: ۴۱۱، "تذكرة الحفاظ" للذهبي ۴/۱۴۳۰-۱۴۳۲، "سير أعلام النبلاء"، ۲۳/۱۴۰-۱۴۴، "دول الإسلام" ۲/۱۱۲، "العبر" ۵/۱۷۷-۱۷۸، "طبقات الشافعية" للسبكي ۸/۳۲۶-۳۳۶، "طبقات الشافعية" للإسنوي ۲/۱۳۳-۱۳۴، "البداية والنهاية، ۱۳/۱۶۸-۱۶۹، "تاريخ علماء بغداد" المسمى "منتخب المختار" لابن رافع ۱۳۰-۱۳۳، "النجوم الزاهرة" ۶/۳۵۴، "طبقات الحفاظ" للسيوطي ۴۹۹ - ۵۰۰، «، "الأنس الجليل بتاريخ القدس والخليل" للعليمي ۲/۱۰۴، "طبقات المفسرين" للداوودي ۱/۳۷۷-۳۷۸، "شذرات الذهب" ۵/۲۲۱، "تاريخ الأدب العربي" لبروكلمان ۶/۲۰۲-۲۲۱، "الأعلام للزركلي" ۴/۲۰۷-۲۰۸، "معجم المؤلفين" لكحالة ۶/۲۵۷۔

ابن الصلاحؒ کا سب سے بہترین ترجمہ ڈاکٹر نورالدین عتر نے کتاب "علوم الحدیث" پر اپنی تحقیق کے مقدمے میں ذکر کیا ہے، جسے دارالفکر، دمشق نے طبع کیا ہے، اسی طرح دیکھیے: مجلہ "البصائر" عدد ۲، صفحہ ۷ وما بعد۔

أدب الفتوى والمفتي والمستفتي:

جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ امام نوویؒ نے اس کتاب میں مذکورہ تینوں کتابوں کے مضمون کو جمع کر دیا ہے، اور متفرق علماء کے عمدہ ترین اقوال بھی بطور فائدہ کے ساتھ جمع کر دیے ہیں۔

امام نوویؒ نے ان تین کتابوں کا اختصار کرتے ہوئے دو کتابوں کا مضمون ہمارے لیے محفوظ کر دیا ہے، ایک صیمری کی کتاب جس کا کوئی بھی نسخہ اس دور میں موجود نہیں، اگرچہ پہلے علماء اس سے بخوبی واقف تھے، اور دوسری کتاب خطیب بغدادیؒ کی، اسے بھی قدیم علماء میں سے کم ہی لوگ جانتے تھے، ان میں سے ایک امام نووی بھی تھے، ہمارے دور میں اس کتاب کا وجود بھی کم ہی ہے۔

مؤلفؒ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں فتوی کی اہمیت، فضیلت اور خطورت پر بحث پیش کی ہے، پھر اس کے بعد تین فصلیں اس موضوع پر قائم کی ہیں کہ فتوی دینے کا اہل کون ہے، مفتی کا متقی و پرہیز گار ہونا ضروری ہے اور مفتی کے لیے شروط۔

"مستقل اور غیر مستقل" کے عنوان سے فصل قائم کی ہے مفتیوں کی اقسام اور احوال کے بیان میں۔

اس کے بعد مفتی کی اہلیت کے بارہ میں ایک فصل میں بحث کی ہے۔

پھر تین مختلف عناوین پر مسائل جمع کیے ہیں۔

1. مفتی کے احکام۔
2. فتوے کے آداب۔
3. فتوی طلب کرنے والے کے آداب، صفات اور احکام۔

امام نوویؒ نے اپنی کتاب کو اسی طرح مرتب کیا ہے، اس طرح انہوں نے اپنی اصل کتابوں کی ترتیب کی خلاف ورزی کی ہے، ابن الصلاح کی کتاب کا مراجعہ اور امام نووی کی کتاب سے مقارنہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ امام نوویؒ نے ابن الصلاح کی

کتاب کے تمام مضامین بالاستیعاب ذکر کیے ہیں لیکن ایک نئے انداز اور جدید ترتیب میں، انہوں نے اپنی کتاب کو قابل فہم اور مضبوط بنیاد پر استوار کیا ہے۔

اس کتاب کا موضوع صرف دینی احکام سے متعلق فتاوی جات سے ہی نہیں ہے بلکہ ہر کوئی خواہ وہ سائل ہو یا مسئول کسی بھی مسئلہ میں تو اس کتاب کا محتاج ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ دور میں کوئی بھی ملازمت پیشہ فرد جسے لوگوں کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا ہے وہ اس کتاب کا محتاج ہے، وہ اس کتاب سے سیکھ سکتا ہے کہ کیسے وہ بہترین جواب دے سکتا ہے اور کیسے اپنی تحریر کو خوامخواہ کی طوالت سے محفوظ بنا سکتا ہے، اس کے علاوہ وثیقہ نویس اور اسناد وغیرہ کی تیاری میں معاون افراد بھی اس مختصر کتاب سے بعض اساسی قواعد سیکھ کر استفادہ کر سکتے ہیں۔

نصِ کتاب کی تخریج میں طریقہ کار:

اس نص کی تخریج میں متعدد مخطوطات اور مطبوعات پر اعتماد کیا گیا ہے:

معتمد علیہ مخطوطہ دمشق کے مکتبہ اَسد میں محفوظ ہے، رقم المخطوط (۲۲۲۸)، یہ کتاب "المجموع شرح المهذب" سے کاپی شدہ نسخہ ہے۔

صفحہ (۱۹/ب سے لے کر ۲۸/آ) تک کتاب کی عبارت درج ہے۔

رہی بات مطبوعات کی جن سے استفادہ کیا گیا ہے، تو یہ کتاب "المجموع شرح المهذب" طبعہ اول، سنہ ۱۳۴۵ھ، دارالطباعہ المنیریہ سے کاپی شدہ ہے نسخوں کا اختلاف یا زیادات جو الأذرعی کے نسخے میں واقع ہیں میں نے بھی انہیں ہی برقرار رکھا ہے۔ عبارت کی تحقیق میں تفاصیل، ترقیم، اِعراب اور فہارس کا خاص اہتمام بھی کیا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے توفیق کا طلب گار ہوں، اور دعا گو ہوں کہ وہ اسے نفع بخش بنائے، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

دمشق: ۱۹۸۸/۲/۲۰ء — بسّام عبدالوهاب الجابی۔

مشمولاتِ کتاب

فتویٰ، مفتی اور مستفتی کے آداب

بخوبی علم ہونا چاہیے کہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے، اور اس کی ضرورت بھی اکثر رہتی ہے اس لیے میں نے اسے پہلے ذکر کرنا مناسب سمجھا ہے، اس مسئلہ پر ہمارے علماء کی ایک جماعت نے قلم اٹھایا ہے، ان میں سے ایک **ابوالقاسم الصیمری** ہیں آپؒ "**الحاوی**" کے مصنف کے استاد ہیں، پھر ابوبکر الخطیب البغدادی اور ابو عمرو ابن الصلاح رحمہما اللہ نے بھی لکھا، ہر کسی نے دوسرے سے منفرد کام کیا ہے، میں نے تینوں کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی مختصر مگر جامع تلخیص لکھی ہے جو تینوں کے مضامین کو شامل ہے، اس پر مستزاد میں نے بعض علماء کے مفید اقوال بھی ساتھ جمع کر دیے ہیں، وباللہ التوفیق۔

مقدمہ

فتویٰ کی اہمیت، فضیلت اور فتوی دینے میں احتیاط

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ فتویٰ دینا بہت فضیلت والا عمل ہونے کے باوجود بہت خطرناک اور قابل احتیاط عمل ہے؛ اس لیے کہ مفتی انبیاء (علیہم الصلاۃ والتسلیم) کا وارث ہے، اور ایک اہم فرض کفایہ کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے، باوجود اس کے اس سے بھی خطا سرزد ہو سکتی ہے۔ اسی لیے علماء فرماتے ہیں: کہ "مفتی اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کنندہ ہوتا ہے"۔

ہمیں ابن المنکدر سے روایت بیان کی گئی، انہوں نے فرمایا: "عالم اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہوتا ہے لہذا اسے اس واسطے کا خیال رکھنا چاہیے"۔

سلف صالحین اور خلف فاضلین سے فتوی دینے میں توقف اختیار کرنے کے بارے بہت ساری چیزیں منقول ہیں، ان میں سے چند ایک ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

عبدالرحمن بن ابی لیلیٰؒ فرماتے ہیں: میں نے ایک سو بیس انصار صحابہ کرامؓ کو پایا، ان میں سے جس سے بھی کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ سائل کو دوسرے صحابی رسول کی طرف بھیج دیتے، وہ آگے کسی اور کی طرف، یہاں تک کہ سائل پہلے صحابی رسول کے پاس واپس لوٹ آتا۔

ایک روایت میں ہے: کہ صحابہ کرامؓ میں سے جب بھی کوئی حدیث بیان کرتا تو اس کی خواہش ہوتی کہ اس کا ساتھی بھی اس کی تائید کرے، اور جب بھی ان سے کوئی فتوی طلب کیا جاتا تو ان کی خواہش ہوتی کہ کوئی دوسرا اس فتوے کا بوجھ اٹھالے۔

عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ "جو ہر سوال کے جواب میں فتوی صادر کر دیتا ہے وہ مجنوں ہے"۔

شعبی، حسن اور ابو حصین تابعین عظام فرماتے ہیں: تم کسی بھی مسئلہ میں فتوی دے دیتے ہو جبکہ سیدنا عمر بن خطابؓ ایک فتوے کے لیے تمام بدری صحابہ کرامؓ کو جمع کر لیتے تھے۔

عطاء بن سائب تابعیؒ سے روایت ہے: میں ایک پوری قوم سے ملا ہوں جن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ جواب دیتے وقت ان پر گھبراہٹ طاری ہوتی تھی۔

ابن عباس اور محمد بن عجلان سے مروی ہے: جب کوئی عالم "لاأدری"، "میں نہیں جانتا" کہنے میں غفلت برتتے تو وہ مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

سفیان بن عیینہؒ اور سحنونؒ سے روایت ہے: فتوی دینے میں جری انسان بہت کم علم ہوتا ہے۔

امام شافعیؒ سے مروی ہے: ان سے کسی مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب نہ دیا؛ دوبارہ پوچھنے پر انہوں نے فرمایا: (میں تب تک خاموش رہوں گا) جب تک مجھے علم نہ ہو جائے کہ خاموشی زیادہ افضل ہے یا سوال کا جواب۔

اثرمؒ فرماتے ہیں: میں نے احمد بن حنبلؒ سے سنا، وہ اکثر کہا کرتے تھے "لاأدری"؛ اور یہ بات آپ ہر اس مسئلے میں کہا کرتے جس میں آپ علماء کے اقوال بھی جانتے تھے۔

ھیثم بن جمیل کہتے ہیں: میں امام مالکؒ کی مجلس میں موجود تھا، امام مالک سے اڑتالیس مسائل سے متعلق پوچھا گیا جن میں سے بتیس مسائل کے جواب میں انہوں نے "لاأدری"، "مجھے نہیں معلوم" کہا۔

امام مالکؒ کے بارہ میں ہی مروی ہے کہ بسا اوقات ان سے پچاس مسائل پوچھے جاتے، ان میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہ دیتے، آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو کسی مسئلے کا جواب دے تو اسے چاہیے کہ جواب دینے سے پہلے خود کو جنت یا جہنم پر پیش کرے، کہ جہنم سے خلاصی کیونکر ممکن ہے پھر جواب دے۔

ان سے ایک مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا، کہا گیا کہ یہ تو بہت آسان اور چھوٹا سا مسئلہ ہے؛ آپؒ اس پر شدید برہم ہوئے اور فرمایا: علم میں سے کوئی چیز ہلکی اور چھوٹی نہیں ہوتی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: کہ میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا کہ اس میں فتوی دینے کی اہلیت ابن عیینہؒ سے بڑھ کر ہو، باوجود اس کے وہ فتوی دینے میں سب سے زیادہ سکوت اختیار کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: اگر مجھے علم کے ضائع ہوجانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بالکل بھی فتوی نہ دیتا، لوگوں کے لیے تو یہ آسان بات ہے جبکہ مجھ پر بوجھ ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے بہت سارے مزید اقوال معروف ہیں۔

امام صیمریؒ اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: جو لوگ فتوی دینے میں حریص اور جلد باز ہیں اور یہی ان کی عادت ہے ان سے توفیق چھن جاتی ہے اور ان کا معاملہ اضطراب کا شکار رہتا ہے، اور اگر کوئی اس منصب کو ناپسند کرتا ہو، اسے بالکل ترجیح نہ دیتا ہو، جب بھی اس سے فتوی طلب کیا جاتا ہے تو اسے کسی دوسرے مفتی کی طرف بھیج دیتا ہے، تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد اکثر ہوتی ہے، اور اس کے جواب میں درستی اور صواب غالب ہوتا ہے۔

ان کا استدلال حدیث صحیح میں اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان سے ہے: کہ

"تم امارت کا مطالبہ نہ کرو، اگر تمہارے مطالبے پر تمہیں امارت دے دی جائے تو تم اس کے سپرد کردیے جاتے ہو، اور اگر بغیر مطالبے کے تمہیں امارت مل جائے تو پھر اس ذمہ داری کو نبھانے میں تمہاری مدد کی جاتی ہے۔"

فصل

کون فتوی دینے کے لائق ہے؟

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: امام (حاکم) کو چاہیے کہ مفتیوں کے احوال کی جانچ پڑتال کرے، اور جو فتوی دینے کا اہل ہو اسی کو مقرر کرے، اور جو فتوی دینے کا اہل نہیں اسے فتوی دینے سے سختی سے روک دے، دوبارہ فتوی دینے کی صورت میں اسے سزا سنائے۔ مفتی کی جانچ پڑتال کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے ہم عصر علماء سے اس کے بارے میں دریافت کرے اور ان میں سے قابل اعتماد کی خبر پر یقین کرے۔

پھر انہوں نے اپنی سند سے امام مالکؒ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے تب تک فتوی نہیں دیا جب تک میرے بارے میں ستر علماء نے شہادت نہیں دی کہ میں فتوی دینے کا اہل ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ: میں نے اپنے سے زیادہ بڑے عالم سے پوچھے بغیر کبھی فتوی نہیں دیا، کہ آیا میں اس قابل ہوں کہ نہیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: کسی انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ خود کو کسی کام کا اہل سمجھے، یہاں تک کہ وہ اپنے سے بڑے عالم سے سوال کر لے۔

فصل

مفتی کے لیے ورع و دیانت داری لازمی ہے:

علماء کا کہنا ہے کہ مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شخصیت سے ورع و تقویٰ اور دیانت داری ظاہر ہوتی ہو۔

امام مالکؒ وہ اعمال بھی کیا کرتے تھے جو وہ دوسروں کے لیے لازمی نہ سمجھتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ: کوئی اتنی دیر تک صحیح معنوں میں عالم بن ہی نہیں سکتا جب تک وہ اپنے آپ کے لیے کچھ ایسے اعمال خاص نہ کرلے جو دیگر لوگوں کے لیے ضروری نہیں۔ یعنی لوگ اگر وہ اعمال نہ بھی کریں تو وہ گناہ گار نہیں ہوں گے، اسی طرح کی بات وہ اپنے شیخ ربیعہ سے بھی نقل کیا کرتے تھے۔

فصل

مفتی کے لیے شروط

مفتی کے لیے شرط ہے کہ وہ مکلف ہو، مسلمان ہو، قابلِ اعتماد ہو، اسبابِ فسق اور خلافِ مروّت اُمور سے اجتناب کرنے والا، فقیہ، قلبِ سلیم اور فکرِ سلیم رکھتا ہو، معاملات میں بااختیار اور استنباط کی صلاحیت رکھنے والا بیدار مغز ہو؛ خواہ آزاد ہو یا غلام، خواہ عورت ہو، خواہ نابینا اور گونگا و بہرہ ہو لیکن لکھنا جانتا اور اشارات سمجھتا ہو۔

ابو عمرو ابن الصلاح فرماتے ہیں: ضروری ہے کہ مفتی راوی الحدیث کی طرح ہو، کہ روایت کی طرح قرابت و عداوت، نفع و نقصان کی پروا نہ کرتا ہو، اس لیے کہ مفتی شارع کے حکم میں ہے، جسے کسی خاص شخص سے اختصاص نہیں ہوتا یعنی وہ راوی کی طرح ہے نہ کہ گواہ، اور اس کا فتوی قاضی کے فیصلے کی طرح الزامی بھی نہیں ہوتا۔

صاحب "الحاوی" کا قول ہے: جب کوئی مفتی اپنے فتوے میں کسی نامزد شخص پر طعن کرتا ہے، تو وہ حریفِ مخالف کی طرح ہو جاتا ہے، اس وقت اس کا فتوی ردّ کر دیا جائے گا جیسے کہ دشمن گواہ کی گواہی ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔

علماء کا اتفاق ہے کہ فاسق آدمی کا فتوی درست تصور نہیں ہوگا، خطیب بغدادیؒ نے اس میں مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔

مفتی کے لیے ضروری ہے کہ جب کوئی واقعہ رونما ہو تو اسے اپنا بھرپور اجتہاد کرنا چاہیے؛ مستور الحال مفتی (جو ظاہری طور پر تو عادل معلوم ہو، لیکن اس کی باطنی حالت نامعلوم ہو) کے فتوے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی اور صحیح صورت یہی ہے کہ اس کا فتوی جائز ہے کیونکہ باطنی عدالت کے بارے میں جانچ پڑتال قاضی کے علاوہ بہت مشکل ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شہادت کی طرح اس کا فتوی بھی جائز نہیں ہے، یہ اختلاف بھی ایسے ہی ہے جیسے مستور الحال گواہوں کی موجودگی میں صحت نکاح میں اختلاف ہے۔

صیمریؒ کا قول ہے کہ خواہش پرست اور خوارج، اسی طرح جس بدعتی کو فاسق یا کافر نہ کہا گیا ہو، کا فتوی صحیح ہے۔

خطیبؒ نے یہ نقل کرنے کے بعد فرمایا: البتہ شر پسند اور روافض (جو سلف صالحین کو سب وشتم کرتے ہیں) کے فتاوی جات مردود ہیں، اور ان کے اقوال کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ماوردیؒ کے نزدیک قاضی جواز فتوی میں دیگر مفتیوں کی طرح ہے بغیر کسی کراہت کے، اور ہمارے نزدیک یہی صحیح موقف ہے۔

شیخ ابو عمرو ابن الصلاحؒ کا قول ہے کہ میں نے ابو حامد الاسفرائینی کی بعض تعلیقات میں دیکھا ہے، کہ قضاء کے علاوہ دیگر احکام اور عبادات میں ان کا فتوی درست ہے البتہ قضاء میں ان کے فتوے بارے ہمارے علماء کے دو اقوال ہیں:

ایک یہ کہ ان کا فتوی جائز ہے کیونکہ وہ اس کی اہل ہیں۔

دوسرا یہ کہ ان کا فتوی جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس میں متہم تھے۔

ابن المنذرؒ کہتے ہیں: قاضی کے لیے شرعی احکام سے متعلقہ مسائل میں فتوی دینا مکروہ ہے۔

قاضی شریحؒ کا قول ہے: کہ میں قاضی ہوں، میں مفتی نہیں ہوں۔

فصل

مفتی کی اقسام

ابو عمرو ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں: فتوی دینے والوں کی دو اقسام ہیں: مستقل اور غیر مستقل۔

مستقل: مفتی کی جو شروط پیچھے گزر چکی ہیں ان کے ساتھ ساتھ مستقل مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقیہ ہو ،احکام شریعہ کی معرفت کے دلائل یعنی کتاب و سنت، اجماع اور قیاس وغیرہ کو تفصیلاً جانتا اور سمجھتا ہو، شروط اَدلّہ اور وجوہ الدّلالۃ کا عالم ہو اور ان سے اَحکام اَخذ کرنے کی کیفیات سے بھی بخوبی واقف ہو، اس سلسلے میں اصولِ فقہ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

علوم القرآن، علوم الحدیث، ناسخ و منسوخ، نحو و صرف، لغت اور علماء کے اختلافات و اتفاقات کو اچھی طرح پہچانتا ہو، ان علوم کو استعمال کرنے کے فن سے واقف ہو، علوم فقہ اور مسائل اَصلیہ و فرعیہ اس کو اَزبر ہوں۔ چنانچہ جس میں یہ سارے اوصاف جمع ہوں، وہ مفتیِ مطلق و مستقل ہے، جس کے ذریعے فرض کفایہ کی ادائیگی ہوتی ہے، وہ مجتہدِ مطلق و مستقل بھی ہے، اس لیے کہ وہ کسی مذھبِ معیّن کی تقلید و تقیید کے بغیر اَدلّۂ شرعیہ سے استنباط کرسکتا ہے۔

ابو عمرو ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں کہ جو ہم نے شرط لگائی ہے کہ اس کو فقہی مسائل حفظ ہوں، یہ شرط اکثر کتبِ مشہورہ میں مذکور نہیں ہے، اس لیے کہ یہ منصبِ اجتھاد کے لیے شرط نہیں ہے، اس لیے کہ فقہ اجتھاد کا ہی ثمرہ و نتیجہ ہے جو کہ متأخر ہے، اور کسی چیز کی شرط اس سے متأخر نہیں ہوتی۔ استاد ابواسحق اسفرائینی اور ان کے مصاحبِ خاص ابو منصور

البغدادی وغیرہ نے بھی یہ شرط لگائی ہے؛اور مفتی فرضِ کفایہ میں یہ شرط صحیح ہے،اگرچہ مجتہدِ مستقل میں یہ شرط نہیں پائی جاتی۔

یہ بھی شرط نہیں ہے کہ تمام احکام اس کے ذہن میں جمع ہوں،بلکہ اگر اس کو اکثر احکام یاد ہیں تو کافی ہے کیوں کہ باقی احکامات کا ادراک اس کے لیے ممکن ہے۔

کیا یہ بھی شرط ہے کہ وہ علم حساب (ریاضی) جانتا ہو،جس کے ذریعے وہ حسابی فقہی مسائل کی تصحیح کر سکے؟

ابو اسحاق اور ابو منصور نے اس میں ہمارے علماء کا اختلاف بیان کیا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ یہ شرط ہے۔

شریعت کے تمام ابواب میں مفتیِ مطلق میں مذکورہ تمام علوم کا اجتماع شرط ہے، البتہ کسی خاص باب میں فتویٰ دینے والا جیسے کہ مناسک حج یا فرائض وغیرہ تو اس کے لیے صرف اسی باب میں ماہر ہونا کافی ہے،امام غزالی اور ان کے مصاحب خاص ابن برھان (باء کے فتحہ کے ساتھ) وغیرہ نے بھی یہی بات کہی ہے،بعض علماء نے اس کا مطلقاً انکار کیا ہے ابن الصباغ نے فرائض کے باب میں خصوصی طور پر اس کو جائز قرار دیا ہے۔جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مطلق طور پر جائز ہے۔

غیر مستقل مفتی:ایک لمبے عرصے سے مفقود ہے،اب فتویٰ ائمہ مذاھب کی طرف منسوب ہونے والے مفتیوں کے سپرد ہو چکا ہے،کسی خاص مذھب کی طرف منسوب مفتی کی چار حالتیں ہیں:

پہلی حالت:وہ اپنے امام کا مقلد نہیں ہے نہ مذھب میں نہ ہی اس کی دلیل میں، مستقل مفتی کی صفت سے موصوف ہونے کی وجہ سے،بلکہ وہ صرف اس امام کے طریقۂ اجتھاد کی پیروی کی وجہ سے اس کی طرف منسوب ہے۔

استاد ابو اسحاق اسفرائینی نے اس پہلی صفت کا ہمارے علماء کے لیے دعویٰ کیا ہے، انہوں نے امام مالکؒ کے تلامذہ اور امام أحمدؒ،داودؒ اور اکثر حنفیہ کے بارہ میں بیان کیا

ہے کہ یہ سارے اپنے ائمہ کے مذہب کی تقلید کرتے ہیں، پھر فرمایا: صحیح طریقہ وہی ہے جس کی طرف محققین یعنی ہمارے علماء گئے ہیں،وہ مذہب شافعی ہے، تقلید کرتے ہوئے نہیں بلکہ اس لیے کہ انہوں نے اس طریقہَ اجتہاد و فتاوی کو سب سے درست پایا ہے۔ ان کے لیے اجتہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا،چنانچہ انہوں نے احکام کی معرفت حاصل کرنے کے لیے امام شافعیؒ کے طریق کو اختیار کیا۔

ابو علی السنجیؒ نے بھی اسی طرح کی بات ذکر کی ہے، کہتے ہیں: ہم نے صرف امام شافعیؒ کی اتباع اس لیے کی ہے کہ ہم نے ان کے قول کو سب سے راجح اور درست پایا ہے، نہ کہ ان کی تقلید میں۔

میں کہتا ہوں: جو بات ان دونوں نے ذکر کی ہے یہ موافق ہے اس کے جس کا امام شافعیؒ حکم دیا تھا، امام مزنیؒ نے اپنی مختصر کتاب میں یہ قول ذکر کیا ہے "امام شافعیؒ نے اپنی یا کسی اور کی تقلید سے سختی سے منع فرمایا ہے"۔

ابو عمرو فرماتے ہیں: ان سے تقلید کی مطلق نفی کا دعوی محل نظر ہے، اور امام شافعی کے اکثر پیروکاروں کی معلوم حالت کے برخلاف ہے، ہمارے بعض اصولیوں کا کہنا ہے کہ امام شافعی کے دور کے بعد مجتہد مستقل کا وجود ناپید ہے۔

ایسی حالت میں مفتی کا فتوی عمل اور اجماع و خلاف میں اہمیت کے اعتبار سے مفتی مستقل کی طرح ہی ہے۔

دوسری حالت: یہ ہے کہ وہ کسی ایک امام کے مذہب سے مقید مجتہد ہو، اور اپنے اصولوں کے ثبوت میں دلیل کے اعتبار سے مجتہد مستقل ہو، لیکن اپنے دلائل میں امام کے اصول و قواعد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔

شرط: یہ ہے کہ وہ فقہ، اصول فقہ اور ادلہَ احکام کا عالم ہو، قیاس و معانی کے طُرق سے باخبر ہو، تخریج واستنباط میں مہارتِ تامہ رکھنے والا ہو کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو تو انھیں اپنے امام کے اصولوں کے مطابق حل کرے، مفتی مستقل کی بعض صفات کی وجہ

سے اس سے تقلید کا اظہار نہ ہوتا ہو، یعنی وہ حدیث اور لغت عرب دلیل لیتا ہو، مجتہد مقید اکثر ان دونوں سے استفادہ کرتا ہے، پھر وہ امام کی بیان کردہ نصوص کو اصول بنا کر اس سے استنباط کرتا ہے، جیسے مفتی مستقل نصوصِ شرعیہ کو اصول بناتا ہے، بسا اوقات وہ کسی حکم میں امام کی دلیل پر ہی اکتفاء کرتا ہے اور مفتی مستقل کی طرح معارض نصوص کی بحث و تمحیص نہیں کرتا، یہ صفت ہمارے علماء اصحابِ وجوہ کی ہے۔ ہمارے علماء کے تمام ائمہ یا ان میں سے اکثر کا یہی طریقہ تھا اس طرح کے مفتی کے فتوی پر عمل کرنے والا اپنے امام کا مقلد ہوتا ہے نہ کہ مفتی کا۔

علماء کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس طرح کے مفتی سے فرض کفایہ پورا نہیں ہوتا۔

ابو عمرو کہتے ہیں: فتوی میں اس طرح فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے امام مستقل کے قائم مقام ہے فرع مبنی بر صحیح کا اعتبار کرتے ہوئے، اور وہ یہ ہے کہ میت کی تقلید جائز ہے۔ کبھی مجتہد مقید کسی ایک خاص مسئلہ یا باب میں مجتہد مستقل بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے مسئلہ میں فتوی دے جس میں اس کے امام کی کوئی نص موجود نہیں، لیکن وہ اس مسئلہ کی تخریج امام کے اصولوں پر ہی کرے، یہی صحیح طریقہ ہے، اسی پر عمل ہے، عرصۂ دراز سے مفتیوں کی یہی ڈگر رہی ہے، جب اس طرح کوئی مفتی فتوی دیتا ہے تو مستفتی (فتوی طلب کرنے والا) اس کے امام کا مقلد ہوگا نہ کہ اس کا،

امام الحرمین نے اپنی کتاب "الغیاثی" میں یہی بات کی ہے، کیا ہی مفید یہ کتاب ہے!۔

شیخ ابو عمرو فرماتے ہیں: کہا اختلاف کے باوجود مناسب ہے کہ یہ مسائل کی تخریج کرے، ابو اسحاق الشیرازی وغیرہ کہتے ہیں: جن مسائل کی تخریج ہمارے اصحاب نے کی ہے کیا ان کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کرنا جائز ہے؟ صحیح بات یہی ہے کہ اس کی نسبت امام صاحبؒ کی طرف نہیں ہونی چاہیے۔

بسا اوقات یہ مسائل کی تخریج امام کی معین کردہ نص سے کرتا ہے اور کبھی نص کی عدم دستیابی کی صورت میں اس کے اصولوں پر، اس طرح کہ اسے ان شرطوں پر پوری اترتی کو دلیل مل جاتی ہے، جن سے امام حجت پکڑتا ہے، تو یہ اس کے مطابق فتوی دے دیتا ہے۔

اگر امام نے کسی مسئلہ میں نص بیان کی ہو، اور اسی مسئلہ کے مشابہ کسی اور مسئلہ میں پہلی نص کے برخلاف نص بیان کی ہو، تو یہ مفتی دونوں میں سے کسی ایک نص سے تخریج کرتا ہے، تو اسے قولِ مخرّج کہا جاتا ہے۔

اس طرح کی تخریج میں شرط ہے کہ دونوں نصوص کے درمیان فرق نہ ہو، پس اگر فرق پایا جائے، تو دونوں نصوص کو ظاہر پر ثابت رکھنا واجب ہے، اس طرح کی تخریج میں علماء کے اقوال اکثر مختلف فیہ رہے ہیں، کیونکہ دونوں نصوص میں فرق کے امکان میں بھی اختلاف ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح کی نصوص میں اکثر فرق ہوتا ہے جیسا کہ علماء نے ذکر بھی کیا ہے۔

تیسری حالت: یہ ہے کہ وہ اصحاب وجوہ کے مرتبے کو نہ پہنچا ہو، لیکن فقیہ النفس، اپنے امام کے مذھب کا حافظ اور اس کی ادلّہ کا عارف ہو، ادلّہ کے اثبات، منظر کی درست تصویر کشی، تحریر، تقریر، تمھید اور ترجیح کی صلاحیت رکھتا ہو، لیکن پچھلی دونوں صورتوں میں بیان کردہ مفتیوں سے کم ہو، یعنی حفظ مذھب، استنباط میں مہارت، معرفت اُصول وغیرہ جیسے اوصاف میں ان کے مرتبے کو نہ پہنچا ہو، چوتھی صدی کے اواخر تک اکثر متأخرین کی یہی صفت ہے، یہ وہ مصنفین ہیں جنہوں نے مذھب کی تحریر و ترتیب کی، اور اس میں ایسی تصانیف لکھیں جن سے آج کل اکثر لوگ استفادہ کرتے ہیں، یہ تخریج مسائل میں سابقین کو نہیں پہنچے۔ البتہ ان کے فتاوی جات، تو انہوں نے اس میں تقریباً وہی تفصیلات ذکر کی ہیں جو پہلوں نے کی تھیں، پھر غیر منقول کو انہوں نے اس پر

قیاس کیا ہے اس طرح کہ انہوں نے قیاس جلی پر ہی اکتفاء نہیں کیا؛ ان میں سے بعض کے فتاوی جمع شدہ ہیں، لیکن مذہب میں وہ اہمیت نہیں حاصل کر سکے جو اصحاب وجوہ کے فتاوی کو حاصل ہے۔

چوتھی حالت: اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذھب کی حفاظت کرے اسے آگے نقل کرے، اور اس کی مشکلات و واضحات کے فہم کی ذمہ داری اٹھائے، لیکن اس میں ادلہ کے اثبات اور قیاسات میں کمزوری اور ضعف پایا جاتا ہے۔ اس کی نقل اور فتوے پر اعتماد کیا جاتا ہے، جب تک وہ اس مذھب میں تحریر کردہ کتب سے بیان کرے؛ یعنی امام کی نصوص اور مذھب کے مجتهدین کی فروعات سے، اور جو چیز اسے منقول نہ ملے تو اگر تو اس کے ہم معنی منقول ہو، اس طرح کے اس میں بہت زیادہ غور و فکر نہ کرنی پڑے تو پھر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، اسے اپنے فتوے کے ساتھ ملا لے جائز ہے، اور جو ایسا نہ ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اس میں فتوی دینے سے رک جائے، اور ایسا بہت کم ہوتا ہے، بلکہ امام الحرمین کے بقول یہ بعید ہے کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں مذھب میں کوئی نص موجود نہ ہو، کم از کم اس کے ہم معنی نص یا کوئی ضابطہ و اصول تو ضرور ہوتا ہے جس کے تحت وہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ فقیہ النفس ہو اور اسے فقہ میں سے وافر حصہ ملا ہو۔

ابو عمرو ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں: آخری دونوں حالتوں میں حفظِ مذھب کے لیے اتنا کافی ہے کہ اکثر چیزیں اس کے ذہن میں ہوں، اور جو باقی ماندہ ہیں ان کی معلومات حاصل کرنے میں اسے مہارت ہو۔

فصل

اہلیتِ مفتی سے متعلق بعض مسائل

فتوی دینے والوں کی یہ پانچ اصناف ہیں، ان میں سے ہر قسم میں حفظِ مذہب اور فقہ نفس شرط ہے، تو جو فتوی دینے کی جسارت کرے حالانکہ اس میں یہ اوصاف نہ ہوں گویا کہ اس نے اَمرِ عظیم کا ارتکاب کیا۔

امام الحرمین وغیرہ نے قطعی طور پر فرمایا ہے کہ: اُصولی، ماہر اور مسائل کی تفریع کر سکنے والا فقیہ، اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ صرف انہیں چیزوں کی بنیاد پر فتوی دے، جب بھی کوئی وقعہ رونما ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کے بارے میں سوال کرے، باحث فقیہ کو چاہیے کہ اس واقعہ کو لے کر کبار ائمہ اور ماہر مناظرین سے ملے؛ کیونکہ اس اکیلے میں اتنی صلاحیت اور اہلیت نہیں ہے کہ اس واقعہ کا حکم جان سکے، نہ ہی وہ امام مذہب سے اس واقعہ کا حکم جان سکتا ہے، کیونکہ اس کو امام کی نصوص میں سے کچھ بھی حفظ نہیں، معتبر ترین صورت یہی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: جس نے مذہب کی ایک یا زیادہ کتابیں یاد کر رکھی ہیں، لیکن سابقہ اوصاف میں سے کوئی بھی وصف اس میں نہیں پایا جاتا، اور عامی آدمی کی راہ نمائی کے لیے اس شہر میں اس کے علاوہ اور کوئی مفتی بھی نہیں تو کیا اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اگر کسی دوسرے قریبی علاقے میں مفتی موجود ہو اور یہ عامی آدمی آسانی سے اس تک پہنچ سکتا ہو، تو اس پر واجب ہے کہ حتی الوسع اس تک پہنچنے کی کوشش کرے، اگر نا ممکن ہو تو پھر اپنے ہی مفتی کے سامنے مسئلہ ذکر کرے، اگر وہ بعینہ یہ مسئلہ کسی قابل اعتماد مصنف کی صحیح الثبوت کتاب میں پائے، تو عامی کے لیے اس صاحب کتاب کے الفاظ میں اس مسئلے کا حکم ذکر کر دے، اس طرح عامی آدمی اس قاصر مفتی کا نہیں بلکہ امام مذہب کا مقلد ہو گا۔

ابو عمرو کہتے ہیں: بعض علماء کی کلام میں مجھے ضمناً یہ چیز ملی ہے اور دلیل سے اسے مزید تقویت ملتی ہے۔

اگر وہ اس مسئلے کو بعینہ کہیں لکھا ہوا نہ پائے، تو اپنے پاس لکھے ہوئے کسی بھی مسئلے پر اسے ہر گز قیاس نہ کرے، اگرچہ وہ اسے قیاس غیر فارق تصور کر رہا ہو، کیونکہ اس میں وہ وہم کا شکار ہو سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کیا مقلد کسی کی تقلید میں فتویٰ دے سکتا ہے؟

تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ابو عبداللہ الحلیمی، ابو محمد الجوینی اور ابو المحاسن الرویانی وغیرہ نے اسے حرام قرار دیا ہے، البتہ قفال مروزی نے اسے جائز کہا ہے۔

ابو عمرو کہتے ہیں: حرام کہنے والوں کی مراد یہ ہے کہ وہ اس فتوے کو اس انداز سے ذکر نہ کرے جیسے کہ وہ اپنی طرف سے فتویٰ دے رہا ہو، بلکہ اس فتویٰ کو اپنے امام کی طرف منسوب کرے جس کی یہ تقلید کر رہا ہے، اسی طرح جس مقلد کو ہم مفتی شمار کر رہے ہوتے ہیں حقیقت میں وہ مفتی نہیں ہوتا، چونکہ وہ مفتی کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے یہ ذمہ داری نبھا رہا ہوتا ہے اس لیے اسے بھی مفتی شمار کر لیا جاتا ہے، بہتر یہ ہے کہ وہ یہ کہے: مثلاً: امام شافعی کا مذھب یہ ہے یا اس طرح ہے۔ اور جو امام کی طرف نسبت نہیں کرتا تو وہ ایک معلوم و مشہور چیز پر اکتفاء کر رہا ہوتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

صاحب "الحاوی" نے عامی شخص (جب وہ کسی واقعہ کا دلیل کی بناء پر حکم جان لے) کے بارے میں تین توجیھات ذکر کی ہیں:

پہلی: اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اس حکم کے مطابق فتویٰ دے، اور اس کی تقلید بھی جائز ہے کیونکہ وہ بھی عالم کی طرح اس حکم کو امام سے جان چکا ہے۔

دوسری: اگر اس کی دلیل کتاب و سنت میں سے ہے تو پھر جائز ہے ورنہ نہیں۔

تیسری: مطلق طور پر جائز نہیں ہے، یہی صحیح بات ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

مفتی سے متعلق احکام

اس فصل میں درج ذیل مسائل ہیں:

اوّل: فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے، جب فتویٰ طلب کیا جائے اور وہاں پر کوئی اور فتویٰ دینے والا نہ ہو تو پھر جواب دینا ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر وہاں کوئی اور بھی ہو اور وہ موجود بھی ہو، جو فتویٰ دے سکتا ہو، تو پھر جواب دینا دونوں کے حق میں فرض کفایہ ہوگا، اور اگر کوئی اور مفتی تو ہے لیکن فی الحال موجود نہیں، پھر دو صورتیں ہوں گی:

صحیح ترین صورت یہ ہے کہ فتویٰ دینا کوئی ضروری نہیں، جیسے کہ ابن ابی لیلیٰ کی نسبت سے پیچھے گزر چکا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس صورت میں سوال کا جواب دینا ضروری ہے۔

یہ دونوں شہادت کے قائم مقام ہیں، اور اگر کسی پیش آنے والے واقعہ سے متعلق عامی شخص سوال کرے تو یہ جواب نہ دے۔

ثانی: جب وہ کوئی فتویٰ دے اور پھر اس سے رجوع کرلے، تو اگر تو عامی شخص کو اس کے رجوع کا علم ہو جائے اور ابھی تک اس نے اس کے پہلے فتوے پر عمل نہیں کیا تو پھر اب اس پر عمل کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر اس نے اس کے فتوے کی وجہ سے نکاح کیا اور ابھی تک وہ نکاح قائم ہے لیکن اس نے اپنے فتوے سے رجوع کرلیا، تو اس پر لازم ہے کہ وہ نکاح ختم کردے، جیسے کہ تعیین قبلہ میں اگر مجتہد کا اجتہاد بدل جائے تو دوران نماز ہی مقتدی کو بھی قبلہ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اس کے رجوع سے پہلے مستفتی فتوے کے مطابق عمل شروع کر چکا ہے تو دیکھا جائے گا اگر تو مفتی نے کسی دلیل قطعی کی مخالفت کی ہے تو مستفتی پر لازم ہے کہ اپنے عمل کو منقطع کردے، اور اگر تاحال صورتِ حال اجتہادی ہے تو پھر عمل کو منقطع کرنا لازمی نہیں ہے، کیونکہ

اجتہاد اجتہاد کو منقطع نہیں کرتا۔ یہ تفصیل صیمری، خطیب اور ابو عمرو نے ذکر کی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے، کسی نے اس میں اختلاف کیا ہو میرے علم میں نہیں، اور جو غزالیؒ اور رازیؒ نے ذکر کیا ہے اس میں اختلاف کی صراحت نہیں ہے۔

ابو عمرو کہتے ہیں: اگر وہ امام کے مذہب کے مطابق فتوی دے، پھر رجوع کرلے اس بناء پر کہ اس پر یہ قطعی طور پر واضح ہو گیا ہے کہ امام مذہب کی نص کی مخالفت ہو رہی، تو اس عمل کو منقطع کر دینا واجب ہے، اگرچہ وہ محل اجتہاد ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ اس کے امام کے مذہب کی نص اس کے حق میں ایسے ہی ہے جیسے مجتہد مستقل کے حق میں شارع کی نص۔ البتہ اگر مستفتی کو مفتی کے رجوع کا علم نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، لیکن مفتی پر لازم ہے کہ وہ لوگوں کے عمل کرنے سے پہلے پہلے انہیں اپنے رجوع سے باخبر کرے، اور جنہیں بعد میں رجوع کا علم ہو ان پر بھی عمل کو منقطع کرنا واجب ہے۔

اگر وہ فتوی کسی چیز کو تلف (ختم) کرنے کے بارے میں تھا اور اس پر عمل کرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ فتوی غلط تھا تو ابو اسحاق اسفرائینی کے نزدیک اگر تو مفتی فتوی دینے کا اہل تھا تو اس کی کوتاہی کی بناء پر اس پر چٹی (جرمانہ) پڑے گی، اور اگر مفتی میں اہلیت نہیں تھی تو پھر مستفتی کا قصور ہونے کی وجہ سے مفتی پر کوئی جرمانہ نہیں۔ شیخ ابو عمرو ابن الصلاح نے بھی ایسے ہی بیان کیا ہے اور سکوت اختیار کیا ہے، حالانکہ اس میں اشکال ہے، ہونا تو یہ چاہیے کہ دونوں صورتوں میں جرمانہ مفتی پر نہ ہو کیونکہ لازمی اور ضروری نہیں ہے کہ فتوی پر عمل ہو، یا پھر دونوں صورتوں میں مفتی پر جرمانہ ہونا چاہیے خاص طور پر دوسری صورت میں دھوکا دہی کی وجہ سے، کیونکہ اگر وہ فتوے کا اہل نہیں تو ایسے مفتی پر فتوی دینا ضروری تھا ہی نہیں[1]۔ واللہ اعلم

1 یہاں پر نسخوں کے اختلاف کی وجہ سے عبارت میں کچھ الجھاؤ ہے۔

ثالث: فتوے میں تساہل برتنا حرام ہے، اور جو اس تساہل میں معروف ہو ایسے مفتی سے فتوی لینا حرام ہے۔

تساہل یہ ہے کہ وہ پوری تحقیق نہ کرے اور کما حقہٗ غور و فکر کیے بغیر ہی فتوی صادر کر دے، اگر پوچھے گئے سوال کا جواب وہ پہلے سے جانتا ہے، تو پھر جلدی جواب دینے میں کوئی حرج نہیں، ماضی میں جن سے فوراً جواب دینا منقول ہے، اس کو بھی اسی پر محمول کریں گے۔

یہ بھی تساہل ہے کہ بے جا أغراض اسے حرام یا مکروہ حیلے تلاش کرنے پر ابھاریں، یا کسی کو نفع پہنچانے کے لیے اس کے لیے رخصتوں کی طلب میں، اور کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کے لیے غیر ضروری شدت پیدا کرنے کے لیے مشتبہات کی جستجو کرنا۔

البتہ جس کا ارادہ صحیح ہو، اور وہ بلاشبہ ثواب کی نیت سے حیلہ تلاش کرے جیسے کہ قسم کے کفارے وغیرہ سے بچنے کے لیے، تو قابل تحسین عمل ہے۔

بعض سلف صالحین سے جو اس قسم کے اقوال منقول ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہے، جیسے کہ سفیان ثوریؒ کا قول ہے: کہ "ہمارے نزدیک علم ثقہ عالم کی طرف سے رخصت کا نام ہے، رہی شدت تو وہ ہر کوئی بہت اچھے سے کر سکتا ہے"۔

شبہے پر مبنی حیلہ جس کے فاعل کی مذمت کی جاتی ہے وہ طلاق کے سدِّباب میں حیلہ سُرَیجیہ ہے۔[1]

---

1 یہ احمد بن عمر بن سریج (ت:۳۰۶ھ) کی طرف نسبت ہے، اس کی صورت یہ کہ طلاق دینے والا کہے: جب تجھ پر میری طلاق واقع ہو، یا جب میں تجھے طلاق دوں تو، تو اس سے پہلے تجھے تین طلاق۔۔۔۔۔ دیکھیے: "طبقات الشافعیہ" للسبکی: ۲۴۵/۹-۲۴۶۔

رابع: ضروری ہے کہ جب اس کا مزاج ٹھیک نہ ہو، دل کہیں اور مشغول ہو، ٹھیک طرح سے غور و فکر والی کیفیت نہ ہو؛ جیسے کہ غصہ، شدید بھوک، پیاس، غم، بہت زیادہ خوشی، اونگھ، تھکاوٹ، شدید گرمی، تکلیف دہ مرض، قضاء حاجت، وغیرہ جیسی کوئی بھی حالت طاری ہو جو اسے حدِ اعتدال سے مانع ہو، تو ایسی صورت میں وہ فتویٰ نہ دے، اور اگر وہ اس طرح کی کسی حالت میں فتویٰ دے اور اسے یقین ہو کہ وہ درست فتویٰ دے رہا ہے تو پھر جائز ہے، بہر حال یہ خطرے سے خالی نہیں ہے۔

خامس: فتویٰ دینے والے کے لیے پسندیدہ یہ ہے کہ وہ یہ کام بغیر معاوضے کے فی سبیل اللہ کرے، البتہ بیت المال سے بقدر حاجت اُجرت لینا جائز ہے، اور اگر اس کو ضرورت نہیں ہے پھر بھی وہ فتویٰ دینے کا معاوضہ طے کر لیتا ہے تو یہ صحیح قول کے مطابق حرام ہے۔ اگر اس کے پاس رزق کی کمی نہیں ہے تو اس کے لیے اُجرت لینا جائز نہیں ہے، اور اگر رزق کی کمی ہے، تو پھر بھی وہ صحیح قول کے مطابق فتویٰ طلب کرنے والوں سے اجرت نہیں لے سکتا، صرف حاکم سے لے سکتا ہے۔

ہمارے علماء میں سے شیخ ابو حاتم القزوینی نے حیلہ کیا اور فرمایا: کہ مفتی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تجھے زبانی فتویٰ دے سکتا ہوں تحریری نہیں، اور اگر وہ تحریر کا بھی طلب گار ہو تو پھر اس سے تحریر لکھنے پر اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

صیمری اور خطیب فرماتے ہیں: اگر اہل علاقہ متفقہ طور پر اپنے اموالوں میں سے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں کہ وہ ان کے فتاویٰ کے لیے فارغ البال ہو جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

البتہ تحفہ اور ہدیہ، ابو مظفر سمعانی کے نزدیک فتویٰ دینے والا قبول کر سکتا ہے برخلاف حاکم کے، کہ اس کے لیے تحفہ اور ہدیہ لینا جائز نہیں ہے۔

ابو عمرو فرماتے ہیں: اگر وہ تحفہ بطور رشوت[1] ہو کہ من چاہا فتوی حاصل کیا جاسکے تو پھر یہ حرام ہے، جیسے کہ حاکم کے بارے میں بھی تحفے کا یہی حکم ہے اور دیگر ان تمام معاملات میں بھی جن میں مقابلے میں عوض نہیں لیا جاسکتا۔

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں: جو عالم خود کو فقہ کی تدریس اور فتوی کے لیے وقف کردے تو حکمران کے ذمے ہے کہ اس کے لیے بقدرِ کفایت اتنا وظیفہ مقرر کرے کہ جو اسے فکرِ معاش سے بے پروا کردے، اور یہ بیت المال میں سے ہونا چاہیے۔ انہوں نے اپنی سند سے روایت ذکر کی ہے کہ عمر بن خطابؓ اس طرح کے ہر عالم کو سالانہ ایک سو دینار وظیفہ دیا کرتے تھے۔

سادس: یمین و اقرار وغیرہ جیسے معاملات جو الفاظ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں جائز نہیں ہے کہ کوئی بھی فتوی دے، مگر صرف وہی جو اس علاقے کا رہنے والا عالم ہے یا وہ جو اس علاقے میں بولے جانے والے الفاظ کی مراد اور وہاں کے عُرف سے بخوبی واقف ہو۔

سابع: جس مفتی کا فتوی دینے میں یہ طریقہ کار ہو کہ وہ کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے صرف امام مذہب کا فتوی ہی نقل کرتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ صرف ایسی کتب پر اعتماد کرے جن کے صحیح ہونے کا اسے پورا یقین ہو، اور یہ بھی کہ اس امام کا یہی مذہب ہے؛ اگر اسے یہ تو یقین ہو کہ یہ تصنیف قابل اعتماد ہے لیکن یہ نسخہ غیر معتمد ہے، تو پھر اسے اس نسخے کا متفقہ نسخے سے مقابلہ کرلینا چاہیے، بسا اوقات کوئی ثقہ عالم کسی غیر معتمد نسخے سے بھی یقینی بات معلوم کرلیتا ہے، جب وہ خبیر اور ذہین ہو اور اس فن میں مہارت کی وجہ سے اس پر اسقاط و تغییر والی جگہیں مخفی نہیں رہ سکتی، اور اگر یہ اسقاط و تغییر صرف غیر معتمد نسخے میں ہی ہوں تو ابو عمروؒ کے بقول: وہ غور کرے، اگر تو وہ مذہب کے اصولوں

---

1 دمشقی مخطوط کے حاشیے میں ہے: کہ "اس مسئلہ میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے اس سے پہلے جو سمعانی کا قول ہے وہ اس مسئلے میں واضح ہے۔" اھ۔

کے موافق ہو، اور اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ مذہب کے اس کے ہم مثل مسائل میں نقول نہ ہونے کی صورت میں استنباط کر سکتا ہے، تو پھر وہ اس نسخے کے مطابق فتوی دے سکتا ہے، اور اگر وہ اس عبارت کے قائل کے قول کی حکایت کرنا چاہے، تو یوں نہ کہے: کہ امام شافعیؒ نے یوں فرمایا، بلکہ یہ کہے کہ مجھے امام شافعیؒ کی نسبت سے یہ بات پہنچی ہے۔ اور اگر اس میں اس طرح استنباط کی صلاحیت نہ ہو تو پھر اس طرح فتوی دینا جائز نہیں، اس کے پاس صرف نقل کرنے کا ہی ایک راستہ ہے، وہ اسے بطور فتوی کے ذکر نہیں کر سکتا بلکہ یہ کہے گا کہ میں نے یہ بات فلاں کتاب کے نسخے میں پائی ہے، وغیرہ۔

میرا کہنا ہے کہ مذہبِ شافعیؒ کے مطابق فتوی دینے والا جب نقل کرنے میں متقدمین و متأخرین کی ایک یا دو کتابوں پر اعتماد کرتا ہے تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ متقدمین اور متأخرین کے مابین جزم و ترجیح میں کثیر اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ مفتی مذہبِ شافعی کو نقل کر رہا ہے اور اسے پورا وثوق نہیں ہے کہ مذکورہ تصنیفات میں جو منقول ہے وہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے، یا اختلاف کی صورت میں امام شافعی کے نزدیک یہی راجح ہے، مذہبِ شافعی سے ذرا سی بھی مانوسیت رکھنے والے عالم کو اس میں بالکل بھی شک نہیں ہو سکتا، بلکہ کبھی تقریباً دس مصنفین ایک چیز کا یقین کر سکتے ہیں حالانکہ وہ مذہب میں راجح کی بنسبت شاذ اور جمہور کے موقف کے خلاف ہوتی ہے، اور کبھی وہ امام شافعیؒ کی نصوص کے مخالف ہوتی ہے، آپ اس شرح[1] میں اس کی مثالیں دیکھیں گے، ان شاء اللہ، امید ہے کہ اگر یہ کتاب مکمل ہو گئی تو ہر تصنیف سے مستغنی کر دے گی، اور اس میں مذہب شافعیؒ کی قطعی اور یقینی معلومات ہوں گی، ان شاء اللہ تعالی۔

---

1 یعنی شرح "المھذب" جس کا نام "المجموع" ہے۔

ثامن: اگر وہ کسی حادثہ میں فتوی دے چکا ہو، پھر دوبارہ اسی کی مثل حادثہ رونما ہو تو؛ اگر اسے پہلا فتوی اور اس کی دلیل شرعی یاد ہو، خواہ وہ مفتی مستقل ہو یا مذھب کی طرف منسوب، تو وہ اس حادثہ میں بھی وہی فتوی دے سکتا ہے، اور اگر اسے وہ فتوی تو یاد ہے لیکن اس کی دلیل یاد نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی صورتِ حال پیش آئی ہے کہ اسے رجوع کرنا پڑا ہو، تو ایک قول کے مطابق وہ فتوی دے سکتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس پر دوبارہ غور کرنا واجب ہے، ایسے ہی قاضی جب اجتھاد کی بناء پر کوئی فیصلہ کرے پھر دوبارہ اسی طرح کا مسئلہ پیش آجائے، اور تیمم اور جہتِ قبلہ کی تلاش میں تجدیدِ اجتھاد ضروری ہے۔

قاضی ابوالطیبؒ استقبالِ قبلہ کے باب کے آخر میں تعلیق میں رقمطراز ہیں: اسی طرح عامی شخص اگر اس کے سامنے کوئی مسئلہ رونما ہو، وہ اس کے بارے میں کسی مفتی سے سوال کرلے، پھر اسی طرح کا مسئلہ اسے دوبارہ پیش آئے تو، صحیح قول کے مطابق اس پر لازم ہے کہ وہ اس مسئلے کے بارے میں دوبارہ سوال کرے۔

مزید فرماتے ہیں: الّا یہ کہ وہ کثرت سے پیش آنے والا مسئلہ ہو کہ بار بار اس میں سوال کرنا مشقت کا باعث ہے، تو پھر ضروری نہیں ہے بلکہ پہلی دفعہ اس کا جواب معلوم کرلینا ہی کافی ہے۔

تاسع: مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے فتوے میں صرف اسی قول پر اکتفاء نہ کرے: کہ اس مسئلے میں اختلاف ہے، یا اس میں دو اقوال یا توجیہات یا روایات ہیں، یا اس مسئلے میں قاضی کی رائے کی طرف رجوع کیا جائے وغیرہ؛ کیونکہ یہ کوئی جواب نہیں ہے، اور مستفتی کا مقصد وضاحت ہوتا ہے کہ کس چیز پر وہ عمل کرے۔ تو ضروری ہے کہ بالجزم اسے راجح مسئلہ بتایا جائے، اگر مفتی راجح مسئلہ نہ جان سکے تو توقف اختیار کرنا چاہیے یہاں

تک کہ راجح بات معلوم ہو جائے یا پھر وہ فتویٰ ہی نہ دے، جیسے کہ ہمارے کبار علماء کی ایک جماعت "حِنث الناسی"[1] کے مسئلہ میں فتویٰ دینے سے باز رہی ہے۔



1 یعنی اگر کوئی بھول کر قسم توڑ دے تو آیا اس پر کفارہ ہو گا یا نہیں۔

فصل

آدابِ فتویٰ

اس فصل میں درج ذیل مسائل ہیں:

پہلا مسئلہ: مفتی پر لازم ہے کہ وہ پوری وضاحت سے جواب دے تاکہ کوئی اشکال باقی نہ رہے، اور وہ زبانی جواب پر بھی اکتفاء کر سکتا ہے، اگر اسے مستفتی کی زبان سمجھ نہ آتی ہو تو کسی بااعتماد مترجم سے مدد لے سکتا ہے، اس لیے کہ یہ خبر کی طرح ہی ہے؛ اور مفتی تحریری جواب بھی دے سکتا ہے، اگرچہ تحریر خطرے کا باعث ہو سکتی ہے، قاضی ابوحامدؒ (المَرْوَرُوذی) تحریری فتویٰ سے اکثر گریز کیا کرتے تھے۔

صیمری کہتے ہیں: یہ فتوے کے ادب کے خلاف ہے کہ سوال مفتی کی لکھائی میں ہو، البتہ وہ سوال کی کانٹ چھانٹ کے بعد املاء کروا سکتا ہے۔

شیخ ابواسحاق شیرازیؒ اپنے ورق پر سوال لکھنے کے بعد جواب تحریر فرمایا کرتے تھے۔

اگر رقعہ میں متعدد سوال درج ہوں تو بہتر ہے کہ سوالات کی ترتیب کے مطابق جواب بھی بالترتیب ہی ہوں، عدمِ ترتیب میں بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ (ترتیب) ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ---﴾[1] میں۔

---

1 (سورہ آلِ عمران/آیت:106)

اگر مسئلہ میں کچھ تفصیل ہو تو یہ مطلق طور پر جواب نہ دے کیونکہ یہ خطأ ہے؛ اسے چاہیے کہ سائل سے پوری تفصیل معلوم کرے اور سوال کو ایک ورق پر لکھ لے، پھر جواب دے، یہ زیادہ بہتر اور محفوظ طریقہ ہے، اسے چاہیے کہ جواب کی متعدد اقسام میں سے جو سائل کے لیے مناسب ہو اس پر اکتفاء کرے، اور یہ کہے: یہ اس وقت ہے جب معاملہ یوں ہو؛ اور جواب میں تمام اقسام مع حکم تفصیل سے ذکر کرے، لیکن ائمہ مالکیہ میں سے ابوالحسن القابسی وغیرہ نے اسے ناپسند کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ فاجر لوگوں کے لیے تعلیم ہے؛ اور اگر اسے کوئی مفتی نہ ملے جس سے سوال کرے تو اقسام کی تفصیل کرے اور ان اقسام کو بیان کرنے میں خوب اجتہاد سے کام لے۔

دوسرا مسئلہ: مفتی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ واقعہ کی جو صورت اس کے علم میں ہے اس کے مطابق جواب لکھے جب تک سوال والے رقعہ میں اس کی طرف اشارہ نہ ہو، بلکہ صرف اسی کا جواب لکھے جو رقعہ میں ہے، اور اگر کسی ایسی چیز کا جواب دینا چاہے جو رقعہ میں نہیں ہے، تو یوں کہے: اگر معاملہ یوں یوں ہے تو پھر اس کا جواب یہ ہے۔

علماء کے ہاں مستحب ہے کہ مفتی رقعہ میں موجود سوال سے زائد کوئی چیز جو اس مسئلہ سے متعلق ہو اور سائل کو اس کی ضرورت بھی ہو، ذکر کر دے۔ جیسے کہ حدیث: "هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ الحِلُّ مَيْتَتُهُ" میں ہے۔

تیسرا مسئلہ: اگر مستفتی بات جلدی نہ سمجھ سکے تو اسے نرمی والا رویہ اپنانا چاہیے، اور اس کا سوال سمجھنے اور پھر اسے جواب سمجھانے میں صبر کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اس کا اسے بہت زیادہ اَجر ملے گا۔

چوتھا مسئلہ: مفتی کو چاہیے کہ سوال والے رقعے میں خوب غور و فکر کرے، آخری حصے میں تو بہت زیادہ، کیونکہ اصل سوال سب سے آخر میں ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے کہ پوری عبارت کو آخر میں ایک کلمے میں قید کیا گیا ہوتا ہے اور اسی سے غفلت ہو سکتی ہے۔

صیمریؒ کہتے ہیں: بعض علماء کا کہنا ہے: کہ آسان سے مسئلے کو حل کرنے میں بھی اسے اتنی ہی جستجو کرنی چاہیے جتنی کہ مشکل مسئلے میں درکار ہوتی ہے تاکہ اس کی عادت بنی رہے۔

محمد بن الحسن ایسے ہی کیا کرتے تھے۔

اگر مفتی سوال والے رقعے میں کوئی غیر واضح کلمہ پائے تو مستفتی سے اس کی بابت استفسار کرے حتی کہ نقطوں اور اعراب سے متعلق بھی، اسی طرح اگر کوئی فحش غلطی یا ایسی خطاَ جو معنی میں خلل پیدا کر رہی ہو، پائے تو اس کی اصلاح کر دے، اور اگر سطر کے درمیان یا آخر میں کوئی خالی جگہ دیکھے تو اس پر خط لگا دے یا وہاں کوئی نشان لگا دے (یعنی اسے خالی نہ رہنے دے)؛ اس لیے کہ بسا اوقات فتوی تحریر ہو جانے کے بعد مفتی کو تکلیف پہنچانے کے لیے سائل اس خالی جگہ میں کچھ ایسا لکھ سکتا ہے جس سے سارا فتوی خراب ہو سکتا ہے، جیسے کہ اسی طرح کی آزمائش سے قاضی ابو حامد المرْوَرُوذی کو دوچار ہونا پڑا تھا۔[1]

پانچواں مسئلہ: مفتی کے لیے مستحب ہے کہ حاضرینِ مجلس میں سے فتوی کی اہلیت رکھنے والے علماء کے سامنے اس کو پڑھے اور اپنے سلف صالحین کی اقتداء کرتے ہوئے ان سے مشاورت کرے، اور اگر ضرورت ہو تو نرمی اور انصاف کے ساتھ ان سے بحث و

---

1 بعض لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتے ہوئے لکھا: اس آدمی کے بارے میں آپ کیا فتوی دیں گے جو مر گیا اور اپنے پیچھے ایک بیٹی اور ایک ماں کی طرف سے بہن وارث چھوڑی؟ پھر انہوں نے سطر کے آخر میں ایک کلمہ کے برابر خالی جگہ چھوڑ دی، اور نچلی سطر کے شروع میں لکھا: اور ایک چچا کا بیٹا بھی۔ چنانچہ قاضی ابو حامدؒ نے فتوی دیا کہ: بیٹی کو نصف، اور باقی چچا کے بیٹے کو ملے گا، لوگوں نے اپنی طرف سے آپ کی لکھائی میں خالی جگہ پر "وأب" کا لفظ زائد کر دیا، جس کی وجہ سے فتوی غلط ہو گیا اور ان کو بہت طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا، اور فتوی بصرہ کے رؤساء کی دو جماعتوں کے درمیان فتنہ کا سبب بنا۔ "آدب المفتي والمستفتي لابن الصلاح" صفحہ ۴۷۔

مباحثہ بھی کرے، اگرچہ وہ اس سے کم علم اور اس کے تلامذہ ہوں، اس امید پر کہ ہو سکتا ہے اس سے کوئی چیز مخفی رہ گئی ہو جو مشاورت کے بعد ظاہر ہو جائے۔ البتہ اگر اس فتویٰ کو ظاہر کرنے میں کوئی قباحت ہو، یا سائل اس کو مخفی رکھنا چاہتا ہو یا اس کی تشہیر کی صورت میں کوئی خرابی پیدا ہو سکتی ہو تو پھر ایسا نہ کرے۔

چھٹا مسئلہ: اسے چاہیے کہ سوال کا جواب واضح اور درمیانے خط میں لکھے جو نہ زیادہ باریک ہو کہ پڑھا ہی نہ جائے اور نہ ہی زیادہ موٹا ہو، سطریں بھی متوسط ہوں نہ زیادہ کشادہ اور نہ ہی زیادہ تنگ، عبارت بالکل واضح اور صحیح ہو، کہ عام و خاص آسانی سے سمجھ سکے۔ بعض علماء نے دھوکے اور اشتباہ سے بچنے کے لیے مستحب جانا ہے کہ مفتی کی قلمیں اور لکھائی مختلف نہ ہوں۔

صیمریؒ کے بقول: بہت کم ہی ایسا ہوا ہے کہ کسی مفتی کے خلاف کوئی سازش ہوئی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی معاملات کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔

جواب لکھنے کے بعد نظرِ ثانی کر لینی چاہیے، تاکہ کوئی غلطی یا خلل نہ واقع ہو گیا ہو۔

ساتواں مسئلہ: فتویٰ تحریر کرتے وقت ابتداء میں دورِ قدیم و جدید میں عادت رہی ہے کہ ورق کی بائیں طرف لکھے۔

صیمریؒ وغیرہ کا کہنا ہے کہ: ورق کے درمیان میں یا ایک طرف، جہاں بھی لکھے کوئی حرج نہیں ہے، لیکن بہر حال بسملہ سے اوپر نہ لکھے، اور فتویٰ لکھنے سے پہلے دعا کا اہتمام بہت مناسب ہے۔

امام مالک اور مکحول رحمہما اللہ سے منقول ہے کہ وہ فتویٰ دینے سے پہلے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" ضرور پڑھتے تھے۔

فتویٰ سے پہلے تعوذ، تسمیہ اور حمد و صلاۃ بھی مستحب ہیں، مفتی یہ بھی کہے: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي...﴾ (۲۰ سورہ طٰہٰ / آیت: ۲۵)، صیمریؒ کہتے ہیں: اکثر علماء کی عادت

رہی ہے کہ وہ اپنے فتاوی کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے تھے: "الجواب: وباللہ التوفیق"۔

مزید فرماتے ہیں: اگر یہ عمل صرف طویل مسائل جو کہ فصول پر مشتمل ہوں میں دہرائے اور مختصر میں نہ دہرائے تو یہ بھی ایک صورت جائز ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مطلق طور پر یہ مختار قول ہے، اور اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ ابتداء "الحمد للہ" سے ہونی چاہیے، کیونکہ حدیث ہے: "ہر اچھا کام جسے الحمد للہ سے نہ شروع کیا جائے تو وہ برکت سے خالی رہتا ہے" زیادہ مناسب ہے کہ یہ الفاظ زبان سے بھی دہرائے اور لکھے بھی۔

صیمریؒ کہتے ہیں: جواب کے اختتام پر یہ کہنا کبھی نہ بھولے: "وباللہ التوفیق" یا "واللہ اعلم" یا "واللہ الموفِق"۔

اور یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ "الجواب عندنا" یا "الذی عندنا" یا "الذی نقول به" یا "نذهب إليه" یا "نراه كذا"، اس لیے کہ وہ کہنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

سائل اگر مفتی کے لیے دعاء یا رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ و سلام لکھنا بھول جائے تو مفتی فتوی کے آخر میں اپنے خط میں یہ لکھ دے، کیونکہ عادت یہی ہے۔

میں کہتا ہوں: کہ جب وہ "واللہ اعلم" وغیرہ جیسے الفاظ جو پیچھے گزر چکے ہیں، کے ساتھ جواب ختم کرے، تو اس کے بعد یہ لکھے: "کتبه فلان" یا "فلان بن فلان الفلانی" اپنے معروف قبیلے، شہر یا وصف کی طرف نسبت کے بعد "الشافعی" یا "الحنفی" بھی لکھے، اگر وہ اپنے نام وغیرہ کے ساتھ مشہور ہے تو کوئی حرج نہیں صرف اسی پر بھی اقتصار کر سکتا ہے۔

صیمری کہتے ہیں: بعض کی رائے ہے کہ مفتی اچھی روشنائی کے ساتھ فتوی تحریر کرے تاکہ اسے کھرچا یا مٹایا نہ جاسکے۔

میں کہتا ہوں کہ: فتوے کے لیے کوئی بھی سیاہی خاص نہیں ہے برخلاف کتبِ علمیہ کے، صرف ان میں وہ سیاہی درکار ہوتی ہے جو دیرپا ہو۔ [1]

صیمری کہتے ہیں: اگر فتوی سلطان سے متعلق ہو، تو اس کے لیے دعائیہ کلمات کہے: مثلاً: "ولی الأمر یا سلطان اللہ ان کی اصلاح فرمائے"، "اللہ انہیں راہِ راست پر رکھے"، "اللہ ان کے ارادوں کو مضبوط کرے"، "اللہ اس کے ذریعے امت کی اصلاح فرمائے"، "اللہ اس کا بازو مضبوط بنائے"، اور یہ نہ کہے: "اللہ اسے زیادہ دیر تک باقی رکھے" کیونکہ یہ سلف کے الفاظ میں سے نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: ابو جعفر نحاس وغیرہ نے علماء کا اتفاق نقل کیا ہے سب اس آخری کلمے کو مکروہ سمجھتے ہیں، بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ زنادقہ کا کلمہ ہے، صحیح مسلم میں امّ حبیبہؓ کی حدیث میں اشارہ ہے کہ اس طرح کے دعائیہ کلمات مناسب نہیں ہیں۔

آٹھواں مسئلہ: مفتی کو چاہیے کہ جواب دینے میں اختصار سے کام لے، اختصار بھی ایسا کہ عام لوگ بھی اسے سمجھ سکیں۔

صاحب "الحاوی" فرماتے ہیں: وہ اس طرح کہے: "یہ جائز ہے"، "ناجائز ہے"، "یہ حق ہے"، "یہ باطل ہے"۔

ان کے استاد الصیمری اپنے شیخ قاضی ابو حامد کے بارہ میں بیان کرتے ہیں: کہ وہ جس قدر ممکن ہوتا تھا مختصر جواب دیتے تھے، ان سے ایک مسئلے میں فتوی طلب کیا گیا جس کے آخر میں پوچھا گیا تھا کہ "جائز ہے کہ نہیں؟" تو آپؒ نے صرف یہ لکھا: "نہیں، وباللہ التوفیق"۔

---

1 المداد: اس سیاہی کو کہتے ہیں جس میں کچھ کیمیکلز ڈال کر اسے گاڑھا اور دیرپا بنایا جاتا ہے یہ پینسل وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں الحِبر: عام روشنائی ہوتی ہے جو پین وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے یہ جلدی مٹ بھی جاتی ہے۔

نواں مسئلہ: صیمری اور خطیبؒ فرماتے ہیں: جب کسی شخص کے بارے میں سوال پوچھا جائے، جو یہ کہے: "میں محمد بن عبداللہ سے زیادہ سچا ہوں" یا "نماز فضول چیز ہے" وغیرہ، تو مفتی فوراً یہ نہ کہہ دے: کہ "اس کا خون یا قتل حلال ہے"؛ بلکہ اسے یہ کہنا چاہیے کہ اگر اس بندے کے اقرار یا دلیل سے یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے تو سلطان اس سے توبہ کرنے کو کہے، اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی، اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو پھر اس کو یہ سزا دی جائے گی۔

اور اگر مفتی سے کسی ایسے شخص کے بارہ میں پوچھا جائے، جس نے کوئی ایسی بات کی ہے جو کفر دون الکفر جیسی توجیہات کا احتمال رکھتی ہے، تو اس کو یہ کہنا چاہیے: اس قائل سے پوچھا جائے گا، اگر وہ یہ جواب دے تو پھر اس پر یہ حکم لاگو ہوگا۔

اور اگر کسی ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے قتل کیا ہو یا کسی کی آنکھ وغیرہ پھوڑی ہو تو محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے مفتی وہ تمام شروط ذکر کرے جو قصاص کو واجب کرتی ہیں۔

اور اگر اس نے کوئی قابل تعزیر جرم کیا ہے، تو مفتی اس کا جرم ذکر کرتے ہوئے یہ وضاحت کرے گا: کہ سلطان اسے یہ یہ سزا دے جو اتنے سے زیادہ نہ ہو، یہ صیمری اور خطیب وغیرہ کا قول ہے۔

ابو عمرو کہتے ہیں: اگر مفتی یہ لکھے: کہ "اس پر قصاص ہے یا مشروط تعزیری سزا ہے"، تو اسے مطلق نہیں سمجھا جائے گا بلکہ اسے شرط کے ساتھ مقید کیا گیا ہے تو ولی اُمر شرط کے بارے میں استفسار کرے گا، بہتر ہے کہ مفتی خود ہی اس شرط کی صراحت کر دے۔

دسواں مسئلہ: جب جواب کے لیے جگہ کم پڑ جائے تو بہتر ہے کہ کسی سازش سے بچنے کے لیے بقیہ جواب دوسرے ورق پر نہ لکھے، اسی لیے علماء کہتے ہیں: کہ مفتی اپنے جواب کو سطر کے آخر تک مکمل کرے، اور بالکل بھی خالی جگہ نہ چھوڑے تاکہ سائل اس میں کچھ

اپنی طرف سے اضافہ نہ کرسکے، اور اگر جواب لکھنے کی جگہ سوال نامے کے ساتھ الگ سے منسلک کیا گیا ورق ہو، تو اس منسلک شدہ ورق پر جواب تحریر کرے، اور اگر ورق کی اندرونی جانب پر جواب کے لیے جگہ کم پڑ جائے اور ورق کی پُشت پر لکھنا پڑے، تو صفحے کی اوپر والی جانب لکھے۔ الا یہ کہ مفتی نے جواب لکھنے کی ابتداء پوچھے گئے سوال سے متصل نیچے سے کی ہو، اور جگہ کم پڑنے کی صورت میں اس جواب کو ورق کی پشت پر نچلی آخری سطر پر پورا کردے، تاکہ جواب سے متصل رہے، بعض علماء نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ جواب مکمل کرنے کے لیے ورق کی پُشت پر لکھے نہ کہ حاشیے میں، امام صیمریؒ وغیرہ کے نزدیک ورق کی پُشت کی بنسبت حاشیے میں جواب مکمل کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔

گیارھواں مسئلہ: جب مفتی کو محسوس ہو کہ فتوے کا جواب مفتی کی تمنّا کے برخلاف ہے، اور وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ فتوی ورق پر تحریر کیا جائے، تو مفتی صرف زبانی جواب دینے پر بھی اکتفاء کرسکتا ہے، مفتی کو فتوے میں مستفتی یا مدمقابل میں سے کسی کی طرف داری سے ڈرنا چاہیے، جانب داری کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں: جیسے کہ وہ اپنے جواب میں صرف وہ چیزیں ذکر کرے جو مستفتی کے حق میں ہیں اور جو اس کے خلاف ہیں ان کو چھوڑ دے۔

مناسب نہیں ہے کہ مفتی مسائلِ دعوی و دلائل میں دفاع کی صورتیں از خود بیان کرے، جب اس سے کوئی سوال کرے کہ اس دعوی یا دلیل کا کیونکر دفاع ممکن ہے؟ تو اس کا جواب ہرگز نہ دے، تاکہ کوئی اس طرح حق کے ابطال کی راہ نہ اختیار کرلے، اسے اس حالت سے متعلق سوال کرنا چاہیے جس میں اس کے خلاف دعوی کیا گیا ہے، پوری وضاحت معلوم کرلینے کے بعد اصل حقیقت تک پہنچنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔

صیمریؒ فرماتے ہیں: مفتی اتنا ضرور کرسکتا ہے کہ وہ سائل کی کسی ایسے طریقے کی طرف راہ نمائی کردے جس میں مدمقابل کا ناحق نقصان نہ ہو۔

جیسے کہ کوئی شخص قسم اٹھالے کہ وہ پورا مہینہ اپنی بیوی پر خرچ نہیں کرے گا! تو مفتی اس کو مشورہ دے کہ تم اپنی بیوی کو قرض یا اس کے حق مہر میں سے کچھ دے سکتے ہو یا اس سے کوئی چیز خرید لو پھر اس سے بری ہو جانا (یعنی واپس نہ لینا اس طرح قسم بھی نہ ٹوٹے گی اور بیوی کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی)۔

جیسے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی نے امام ابوحنیفہؒ سے کہا: کہ میں قسم اٹھا چکا ہوں کہ میں رمضان کے دنوں میں اپنی بیوی سے جماع کروں گا لیکن مجھ پر کفارہ بھی نہیں پڑے گا اور نہ ہی میں گناہ گار ہوں گا! تو انہوں نے فرمایا: کہ اپنی کے ساتھ سفر پر چلا جا (پھر ہی ممکن ہے)۔

بارہواں مسئلہ: صیمریؒ فرماتے ہیں: کہ اگر مفتی مصلحت کے پیشِ نظر عامی شخص کو سخت حکم پر مبنی فتوی دے حالانکہ اس مسئلہ میں ظاہر کے برخلاف تاویل کی گنجائش ہو، تو سائل پر سختی کی غرض سے ایسا کرنا جائز ہے؛ جیسے کہ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ان سے قاتل کی توبہ بارے پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا: کہ اس کی توبہ نہیں ہے۔ ایک اور سائل نے بھی یہی سوال پوچھا تو آپؓ نے فرمایا: کہ اس کی توبہ قبول ہے۔ پھر وضاحت فرمائی کہ پہلے کو سخت فتوی اس لیے دیا کہ مجھے اس کی آنکھوں میں قتل کا ارادہ نظر آرہا تھا اس لیے اسے انکار پر مبنی فتوی دیا، اور دوسرا قتل کر چکا تھا اور بے چین تھا اسے مایوسی سے بچانے کے لیے حقیقت پر مبنی فتوی دیا۔

صیمریؒ فرماتے ہیں: ایسے ہی اگر اس سے کوئی یہ سوال کرے کہ اگر میں اپنے غلام کو قتل کر دوں تو کیا مجھے پر قصاص ہے؟ تو وہ یہ جواب دے سکتا ہے کہ اگر تو نے اپنے غلام کو قتل کیا تو ہم تجھے قتل کریں گے، اللہ کے نبی ﷺ سے مروی ہے: "جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کریں گے" یہ فتوی اس لیے بھی درست ہے کہ قتل کے متعدد معانی ہیں۔

صیمریؒ فرماتے ہیں: اگر مفتی سے صحابیِ رسول ﷺ کو گالی دینے والے سے متعلق سوال کیا جائے کہ آیا اسے قتل کیا جائے گا کہ نہیں؟ تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو میرے صحابی کو گالی دے تو اسے قتل کر دو'' یہ سب کچھ عوام الناس اور بے دین وبے مروت پر سختی کی خاطر کیا جا سکتا ہے۔[1]

تیرھواں مسئلہ: اگر مفتی کے پاس متعدد سوالنامے جمع ہو جائیں، تو اس پر واجب ہے کہ ترتیب کے ساتھ جو پہلے آئے ہوں ان کے جواب دے، جیسے کہ قاضی مقدمات نمٹانے میں کرتا ہے، یہ وجوب ان مسائل میں ہے جن میں فتویٰ دینا واجب ہو، اور اگر وہ سارے رقعے اکٹھے آئے ہوں یا ان کی ترتیب کا علم نہ، تو پھر قرعہ کے ذریعے سوالناموں کو ترتیب دے، صحیح بات یہ ہے کہ مفتی کے لیے عورت یا مسافر کے مسئلے کو پہلے حل کرنا جائز ہے، کہ مسافر کو تاخیر کی صورت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، ایسے ہی اگر کسی کو بھی نقصان کا اندیشہ ہو تو مصلحتاً اس کا مقدمہ پہلے نمٹایا جا سکتا ہے، اور اگر مسافر یا عورتیں کثیر ہو جائیں اور ان کے سوالات کے جوابات دینے کی وجہ سے دوسروں کا نقصان ہونے کا خدشہ ہو تو پھر وہ سبقت کی بناء پر ہی مسائل کا جواب دے یا قرعہ اندازی کرلے، اور کسی کو مقدم کرنے کی صورت میں صرف ایک ہی فتوے کا جواب دے بس۔

چودھواں مسئلہ: صیمریؒ اور ابو عمروؒ فرماتے ہیں: جب مفتی سے وراثت کا کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو یہ معمول نہیں ہے کہ ورثاء میں عدم رِق، کفر اور قتل وغیرہ کی شرط جو مانع وراثت ہو ذکر کی جائے، بلکہ مطلق ہی ذکر کیا جاتا ہے اور اس میں بالاَولیٰ یہ شرط سمجھی جاتی ہے، برخلاف اخوہ یا اَخوات اور اعمام وغیرہ کے کہ جب ان کا تذکرہ کرے تو جواب میں

---

1 میں کہتا ہوں: یہ فتویٰ اس وقت دے گا جب اسے یقین ہو کہ اس کے فتوے پر عمل نہیں کیا جائے گا اور اگر یقین ہو کہ اس کے فتوے پر عمل درامد ہو سکتا ہے جیسے کہ سائل اَمیر یا کوئی اور ذمہ دار ہو، تو پھر اس طرح جواب نہ دے بلکہ وہی جواب دے جو وہ اس مسئلہ میں مناسب سمجھتا ہے۔ اھ۔ حاشیہ نسخ الاَذرعی۔

ساتھ "من أب وأم، یا من أب، یا من أم، کی قید ضرور ذکر کرے۔ اور اگر سوال عول سے متعلق ہو جیسے کہ مسئلہ المنبریہ: یعنی مرنے والے کے ورثاء میں بیوی، والدین اور دو بیٹیاں ہوں، تو جواب میں وہ یہ نہ کہے کہ زوجہ کے لیے آٹھواں حصہ ہے نہ کہ نوواں، اس لیے کہ اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا عول کی بناء پر، یہ ستائیس میں سے تین حصے بنتے ہیں، یعنی یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بیوی کو ستائیس میں تین حصے ملیں گے، یا یوں کہے جیسے کہ امیر المؤمنین علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا تھا: کہ عول کی وجہ سے اس کا آٹھواں حصہ نوواں بن جائے گا۔

اور اگر سوال والے رقعے میں کسی ایسے فرد کا بھی ذکر ہو جو وارث نہیں بن سکتا تو اس کے ساقط ہونے کی بھی صراحت کر دے، اور اگر وہ بعض حالتوں میں ساقط ہوتا ہو تو پھر یوں صراحت کرے کہ فلاں شخص اس صورت میں ساقط ہے وغیرہ، تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ وہ کسی بھی حالت میں وارث نہیں بن سکتا۔

جب اِخوہ اور أخوات، یا بیٹے اور بیٹیوں کے بارے میں پوچھا جائے تو اس طرح کہنا مناسب نہ ہوگا: کہ ﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الأُنْثَيَيْنِ﴾ (سورہ النساء/آیت 11)
ترجمہ: کہ مذکر کو مؤنث کی بنسبت دو حصے ملیں گے۔

کیونکہ یہ انداز بسا اوقات عامی کے لیے اشکال کا باعث بن سکتا ہے، بلکہ اسے یہ کہنا چاہیے: بیٹے اور بیٹیاں اتنے حصوں میں ترکہ تقسیم کریں گے، اور ہر بیٹی کو اتنا اتنا حصہ ملے گا، یہ امام صیمریؒ کا قول ہے۔

شیخ ابو عمرو ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں: ہم اس جملے سے عمداً عدول کرنے کو نفس پر گراں سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ قرآن مجید کے الفاظ ہیں، اور کم ہی لوگ اس کے معنی سے ناواقف ہیں۔

مناسخہ سے متعلق مسائل میں ضروری ہے کہ جواب دینے میں بہت زیادہ احتیاط برتی جائے، اسے یہ کہنا چاہیے کہ باپ کی طرف سے، پھر ماں کی طرف سے اور پھر بھائی کی طرف سے وراثت میں سے فلاں کو یہ یہ حصہ ملے گا۔

صیمری کہتے ہیں: بعض لوگوں نے اس قول کو پسند کیا ہے: فلاں کو وراثت میں سے اتنے حصے ملیں گے: باپ کی طرف سے وراثت میں سے اتنا، ماں کی طرف سے اتنا اور بھائی کی طرف سے اتنا۔

کہتے ہیں: بہر حال دونوں الفاظ قریب قریب ہیں۔

صیمری کہتے ہیں: بہتر ہے کہ وہ اس طرح کہے: اگر میت کے ذمے قرض یا اس کی کوئی وصیت ہو تو ان کی ادائیگی کے بعد ترکہ تقسیم کیا جائے گا۔

پندرھواں مسئلہ: اگر مفتی کوئی فتوے والا رقعہ دیکھے جو کسی اور اہلیت رکھنے والے مفتی کا تحریر کردہ ہو اور اس مسئلے میں اس کا بھی یہی موقف ہو، تو:

خطیب بغدادی وغیرہ فرماتے ہیں: کہ اسی تحریر کے نیچے لکھ دے کہ یہ جواب صحیح ہے، اور میں بھی یہی کہتا ہوں، یا اس طرح لکھ دے کہ میرا جواب بھی اسی کی مثل ہے، اگر چاہے تو اس سے بھی آسان عبارت میں اپنا جواب تحریر کر دے۔

اور اگر وہ تحریر کسی ایسے عالم کی ہو جو فتوے کی اہلیت نہیں رکھتا، تو صیمری کے بقول: اس کی موافقت میں فتوی نہ دے، کیونکہ اس طرح تو وہ ایک غلطی کا اثبات کر رہا ہے، بلکہ اسے چاہیے کہ سائل کی مرضی سے اس پر غلط کا نشان لگا دے اور اگر وہ ایسا کرنے کی اجازت نہ دے تو رہنے دے لیکن رقعے کو سائل کی مرضی کے بغیر ضبط نہ کرے۔

مزید فرماتے ہیں کہ مفتی سائل کو حسب ضرورت اس کی کوتاہی سے آگاہ کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ بھی کر سکتا ہے، اس لیے کہ اس پر واجب ہے کہ تلاش کرے کہ کون فتوی دینے کی اہلیت رکھتا ہے اور پھر وہ اس سے فتوی لے؛ اگر اس فتوے میں وہ کسی ایسے شخص کا نام دیکھے جو غیر معروف ہے تو اس کے بارے میں استفسار کرے، اگر اسے نہ

پہچان پائے تو اس کی موافقت میں فتوی دینے سے گریز کرے، کیونکہ ڈر ہے کہ وہ اس غلطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے جس کے بارے میں ہم پیچھے خبر دار کر آئے ہیں۔

بعض علماء اس طرح کی صورت میں ورق کی پشت پر لکھ دیا کرتے تھے۔

لیکن بہتر یہ ہے کہ اس طرح کی صورتِ حال میں مستفتی سے اس رقعے کو تبدیل کرنے کا کہا جائے اگر وہ ایسا نہ کرے تو پھر اسے زبانی جواب دے دے، تحریر نہ کرے۔

ابو عمرو فرماتے ہیں: اگر مفتی کو کسی نا اہل کی طرف سے لکھے گئے فتوے پر غلط کا نشان لگانے میں کسی فتنے کا ڈر ہو اور وہ فتوی غلط بھی نہ ہو، تو اس کی موافقت میں فتوی دینے سے احتراز کرے، اور اگر اس کے منصب، جاہ و جلال یا تلبیس وغیرہ کی وجہ سے اس کے فتوے فوقیت رکھتے ہوں اور اہلیت رکھنے والے مفتیوں کا اس کی موافقت میں فتوی دینے سے اجتناب سائلین کے لیے نقصان کا باعث ہو، تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ اس کی موافقت میں فتوی دے دیا جائے، اس لیے کہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے کم نقصان قابل برداشت ہے۔ اسی طرح جو سائل ان چیزوں سے جاہل ہو تو اس کے ساتھ نرمی والا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

البتہ اگر کوئی ایسا فتوی ہو جس کا مفتی تو اہل ہو لیکن فتوی قطعی نصوص کی مخالفت کی وجہ سے، یا اس خاطی مفتی کے مذہب کی مخالفت کی وجہ سے غلط ہو، تو اس صورت میں اہلیت رکھنے والے مفتی کے لیے فتوے سے اجتناب جائز نہیں ہو گا، ورنہ اس طرح تو وہ اس کی خطاً پر تنبیہ کرنے سے قاصر رہے گا، خاص طور پر جب وہاں پر اس کے علاوہ کوئی اور مفتی بھی موجود نہ ہو۔ اس صورتِ حال میں اس پر لازم ہے کہ اس پہلے فتوے پر غلط کا نشان لگائے، یا اس رقعے کو تبدیل کرے یا سائل کی اجازت سے اسے ٹکڑے کر کے ضائع کر دے۔ اگر یہ سب کچھ نہ کر سکے تو غلطی کی نشاندہی کر کے اس پر درست جواب لکھ دے، پھر اگر فتوے میں غلطی کرنے والا نا اہل مفتی نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس کو مطلع کر دے، اسی طرح اگر وہ فتوی ہو تو کسی اہلیت رکھنے والے مفتی کا، لیکن اس کی رائے کے خلاف ہو، اور

اس کو فتوے کے قطعی طور پر مبنی بر خطا ہونے کا یقین بھی نہ ہو، تو پھر یہ صرف اپنی طرف سے جواب لکھنے پر ہی اکتفاء کرے، اور دوسرے کے فتوے پر نہ تو اعتراض کرے اور نہ ہی اسے غلط کہے۔

صاحب "الحاوی" کہتے ہیں: مفتی کے لیے مناسب نہیں ہے، کہ جب اس سے کوئی فتوی طلب کیا جائے تو وہ کسی دوسرے کے فتوے کو رد کرنے یا غلط کہنے میں لگ جائے، بلکہ اپنے علم کی بناء پر جواب دے خواہ وہ مخالفت میں ہو یا موافقت میں۔[1]

سولھواں مسئلہ: جب مفتی بالکل بھی مسئلہ سمجھ پائے نہ صاحبِ واقعہ حاضر ہو تو:

صیمری کہتے ہیں: مفتی یہ تحریر کردے: کہ "مزید وضاحت کی جائے تاکہ ہم اس کا جواب دے سکیں" یا یہ تحریر کرے: "میں مسئلہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ اس کا جواب دوں"۔ بعض کہتے ہیں: کہ بالکل کچھ بھی نہ لکھے۔

صیمری کہتے ہیں: کہ میں نے بعض حضرات کو دیکھا ہے، وہ لکھ دیا کرتے تھے کہ: "سائل خود حاضر ہو، تاکہ ہم اس سے بالمشافہ بات کریں"۔

خطیب کہتے ہیں: کہ مفتی کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب اسے سوال سمجھ نہ آئے اور کوئی دوسرا مفتی موجود ہو تو اس کی طرف مستفتی کی رہنمائی کردے۔ بصورتِ دیگر وہ خاموش رہے حتی کہ اسے جواب معلوم ہو جائے۔

صیمری کہتے ہیں: جب استفتاء کے کاغذ پر مختلف سوالات ہوں اور بعض سوال اس کی سمجھ میں آجائیں اور بعض وہ سمجھ نہ پائے یا سارے سوال وہ سمجھ گیا جائے، لیکن بعض کے جواب ابھی نہ دے سکتا ہو یا مزید مطالعے اور غور و فکر کا محتاج ہو تو ایسی صورت میں

---

1 نسخہ الاذرعی کے حاشیہ میں ہے: "کہ یہ اس وقت ہے جب پہلے مفتی کا جواب احتمالات پر مبنی ہو، اور اگر وہ جواب غلط ہو تو پھر اس پر تنبیہ لازمی ہے تاکہ اس پر عمل نہ کیا جائے، اسی طرح اگر وہ فتوی ایسا ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ اسی کی مثل حکم لگایا جائے، شیخ عزالدین بن عبدالسلام ایسے ہی کیا کرتے تھے"۔اھ۔

جن سوالات کا وہ جواب دینا چاہتا ہے دے دے، بقیہ سوالات کے بارے میں توقف اختیار کرے اور کہے: "ہمیں بقیہ سوالات کے بارے میں ابھی دیکھنا یا غور و فکر کرنا ہے یا مزید تحقیق کرنا ہے"۔

سترھواں مسئلہ: اگر مفتی اپنے فتویٰ میں واضح اور مختصر نص بطورِ دلیل ذکر کر دے تو یہ قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔

صیمری رقمطراز ہیں: اگر فتویٰ کسی عامی کو دیا جا رہا ہے تو وہاں دلیل ذکر نہ کی جائے، البتہ کسی فقیہ کو فتویٰ دیا جا رہا ہے تو دلائل کا ذکر کر دینا چاہیے۔ جیسے بغیر ولی نکاح کے بارے میں سوال کیا جائے تو حدیث "لا نکاح إلا بولي" ذکر کر دینا مستحسن ہے۔ یا دخول کے بعد مطلقہ سے رجوع کے بارے میں سائل کہے: "میں اس سے رجوع کرتا ہوں" کے متعلق سوال ہو تو قرآن کی آیت: "وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا" (البقرۃ:۲۲۸)۔ "اور ان کے خاوند اس مدت میں ان کے ساتھ رجوع کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں" ذکر کرنا بھی بہتر ہے۔

ایسا نہیں چلتا کہ اپنے استدلال، اجتہاد یا قیاس کے طریقے کو مفتی اپنے فتویٰ میں ذکر کرے الا یہ کہ فتویٰ کسی عدالتی فیصلے سے متعلق ہو۔ ایسی صورت میں مفتی اپنے اجتہاد کے طریق کار کی طرف اشارہ کر دے، نیز نقطوں کو واضح کرے۔ اگر کسی اور کی طرف سے دیے گئے فتوے میں غلطی پائے، یا اس میں کوئی غموض ہو تو اس کی دلیل کے ساتھ تصحیح کر دے۔

صاحب "الحاوی" کہتے ہیں: کہ دلیل ذکر نہیں کی جائے گی تاکہ فتویٰ اور تصنیف میں فرق واضح ہو سکے۔

مزید فرماتے ہیں: کہ اگر تھوڑی سی تفصیل کی گنجائش دی جائے تو وہ زیادہ گنجائش خود ہی پیدا کر لے گا، یوں وہ مفتی نہیں بلکہ مدرس بن جائے گا۔

صاحب "الحاوی" کے مطلق طور پر منع کرنے کی بجائے جو ہم نے تفصیل ذکر کی ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔

بعض اوقات مفتی کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں سختی کرنے میں مبالغہ سے کام لے۔ تو اسے یوں کہنا چاہیے: "اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے" یا "میرے نزدیک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے" یا "جس نے اس کی مخالفت کی اس نے واجب أمر کی مخالفت کی اور وہ درستی سے دور ہو گیا" یا "وہ گناہ و خطا کا شکار ہو گیا ہے" یا "ولی أمر کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا مؤاخذہ کرے اور اس میں بالکل کوتاہی نہ کرے" یا مصلحت و حالات کے پیشِ نظر اس طرح کے کوئی اور الفاظ بھی استعمال کر سکتا ہے۔

اٹھارہواں مسئلہ: شیخ ابو عمرو فرماتے ہیں: مفتی سے اگر کلامی مسائل کے بارے میں سوال کیا جائے تو اسے تفصیل ذکر نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ مستفتی اور عوام الناس کو اس میں غور و خوض بلکہ معمولی دل چسپی لینے سے بھی منع کرنا چاہیے خواہ وہ مسئلہ کس قدر معمولی ہو۔ مفتی انہیں تلقین کریں کہ وہ بغیر تفصیل کے جملہ ایمان پر اکتفا کریں۔

کلامی مسائل، آیاتِ صفات اور اخبارِ متشابہات کے متعلق جو بھی وارد ہوا ہے ان میں یہ کہے: کہ نفسِ امر میں جو بھی ثابت ہے اس کی تفصیل اللہ تبارک و تعالیٰ کے جلال و کمال اور ذاتِ قدسیہ کے لائقِ شان ہے۔ مفتی کو یہ بھی کہنا چاہیے: کہ اس مسئلہ میں یہی ہمارا عقیدہ ہے جس کی تفصیل و تعیین ہم پر لازم نہیں۔ اس بارے میں بحث و تمحیص ہمارے لیے مناسب نہیں، بلکہ اس کی تفصیل کا علم اللہ کی سپرد کرتے ہیں اور اپنے دلوں اور زبانوں کو اس میں غور و خوض اور کلام سے باز رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مسائل میں ائمہ متقین کے لیے ایسا یا اس کی مثل جواب دینا ہی درست ہے۔ اسلافِ امت، مذاہبِ فقہیہ کے معتبر آئمہ اور اکابر علماء و صلحاء کا یہی راستہ ہے۔ عوام الناس اور ان کی مثل افراد کے لئے زیادہ محفوظ اور سلامتی والا طریق بھی یہی ہے۔ جو تفصیل کے باطل اعتقاد کے

قائل ہیں ان کے ان باطل اعتقادات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آسان تر، سہل اور محفوظ تر رائے کو اختیار کرنا چاہیے۔

اگر ولی امر اس طریقہ کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ نمٹنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس تعزیری سزا کو اُسوہ بنانا چاہیے جو آپؓ نے صبیغ نامی آدمی کو دی تھی۔ مذکورہ شخص متشابہات کہ متعلق سوال کیا کرتا تھا۔[1]

صیمری مزید کہتے ہیں: کہ ہمارے شوافع متکلمین علماء اس طریقہ کے صحیح ہونے کے معترف ہیں، جو اپنی زبان کو ایسی گفتگو سے بچائے گا وہ خود کو مامون رکھے گا۔ غزالیؒ اپنے آخری دور میں مذکورہ بالا نظریہ کی طرف بلانے اور اس کے برعکس نظریات کے رد میں دلائل و براہین پیش کرنے میں انتہائی شدت و مبالغہ سے کام لیتے تھے۔ غزالیؒ کے شیخ

---

1 قبیلہ بنی تمیم کا ایک شخص جس کو "صبیغ بن عسل" کہا جاتا تھا مدینہ منورہ آیا اس کے پاس کچھ کتابیں تھیں اور قرآن مجید کے متشابہات کے بارے میں پوچھتا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے ایک آدمی بھیج کر اسے اپنے ہاں بلالیا اور اس کے لئے کھجوروں کی چند بڑی ٹہنیاں تیار رکھیں جب وہ امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا، میں عبد اللہ صبیغ ہوں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کا بندہ عمر ہوں، پھر اس کی طرف بڑھے اور ان ٹہنیوں سے اسے مارنے لگے اسے مسلسل مارتے رہے یہاں تک کہ وہ زخمی ہو گیا اور اس کے چہرے پر خون بہنے لگا، اس نے کہا بس بھی کریں کافی ہو گیا ہے امیر المومنین! خدا کی قسم میں اپنے دماغ میں جو کچھ پاتا تھا وہ نکل گیا ہے یعنی ختم ہو گیا ہے نصر مقدسی اور ابن عساکر نے ابو عثمان نہدی کے حوالے سے صبیغ سے روایت کی، امیر المومنین نے اہل بصرہ کو لکھا کہ وہ صبیغ کے پاس نہ بیٹھا کریں، چنانچہ ابو عثمان نے بیان کیا (کہ اس حکم کے بعد لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ) اگر وہ شخص آتا اور ہم ایک سو کی تعداد میں موجود ہوتے تو ہم ادھر ادھر بکھر جاتے۔ (سنن دارمی)

امام الحرمین اپنی کتاب "الغیاثی" میں ذکر کرتے ہیں: اس حوالے سے امام کو ممکن حد تک عوام الناس کو اسلاف کے طریقہ پر جمع کرنے کا حریص ہونا چاہیے۔

غزالیؒ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کلام کے بارے فتویٰ طلب کیا گیا تو آپ کا جواب تھا: کہ کلام اللہ حروف و آواز سے مرکب ہے کہ نہیں، اس متعلق غور و خوض کرنا بدعت ہے۔ نیز وہ شخص ائمہ دین میں سے نہیں ہو سکتا جو عوام کو ایسے غور و خوض کی طرف بلاتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی تیراکی میں مہارت نہ رکھنے والے بچوں کو سمندر میں غوطہ زن ہونے کی دعوت دے، یا ایسے بوڑھے شخص کو پیدل صحرا میں سفر کرنے کی دعوت دے جو سفر کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔

آپ اپنے رسالہ میں کہتے ہیں: تمام مخلوق کے لئے ضروری ہے ماسوائے چند شاذ و نادر افراد کے جو ایک دو سے زیادہ نہیں؛ کہ جو کچھ بھی اللہ نے نازل فرمایا یا اللہ کے رسول ﷺ نے جس کی خبر دی اس پر سلف کے مسلک پر چلتے ہوئے بغیر کسی بحث و تفتیش کے ایمان لایا جائے اور اس کی تصدیق کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ تقوے میں مشغول رہنے سے اچھی مصروفیت کوئی نہیں۔

صیمری اپنی کتاب "ادب المفتی والمستفتی" میں نقل کرتے ہیں: اہلِ تقویٰ کا اس بات پر اجماع ہے: کہ جو فقہ کے میدان میں مفتی ہو، اس کے لئے علم الکلام کے مسئلہ میں کوئی بھی فتوی تحریر کرنا درست نہیں۔

بعض تو اس طرح کے فتوی کی مکمل قراءت کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔

صیمری کہتے ہیں: بعض نے یہ لکھنے کو ناپسند کیا ہے: کہ "یہ ہمارے متعلقہ علم میں سے نہیں" یا "ہم اس لئے نہیں بیٹھے" یا "اس کے علاوہ کوئی اور سوال بہتر تھا" بلکہ اس طرح کی کوئی چیز نہ لکھے۔

امام حافظ فقیہ ابو عمر ابن عبد البر نے قدیم و جدید اہلِ فتویٰ و اہلِ حدیث علماء و فقہاء سے مذکورہ تمام صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ نیز فرمایا: کہ اہلِ بدعت بھی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

شیخ ابو عمرو ابن الصلاح رقمطراز ہیں: اگر ایسا مسئلہ درپیش ہو جو مذکورہ ضرر رساں غور و خوض اور تفصیل سے مامون ہو تو تفصیلی جواب دینا جائز ہے۔ البتہ اگر جواب مختصر اور قابلِ فہم ہو تو اس میں جھگڑا کرنے والے کھینچا تانی نہیں کر سکتے۔ مذکورہ مسئلہ کے بارے میں سوال رشد و ہدایت کے متلاشی اور جذبہ اطاعت سے سرشار شخص سے صادر ہونا چاہیے یا عامۃ الناس کی طرف سے کہ جن میں تنازعات معمولی اور محدود نوعیت کے ہوتے ہیں۔ نیز ان کو مفتی بھی بہت کم میسر ہوتے ہیں جس کے فتوی کی وہ پیروی کر سکیں۔ سلف کی طرف سے بعض کلامی مسائل میں بغض پر مبنی فتاویٰ جات کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔ بہر حال ایسا بہت کم اور نادر ہے۔ واللہ اعلم۔

انیسواں مسئلہ: صیمری اور خطیب رحمہما اللہ کہتے ہیں: فقیہ سے قرآنِ عزیز کی تفسیر کے بارے میں کوئی سوال کیا جائے۔ تو اگر اس سوال کا تعلق احکام کے ساتھ ہے تو مفتی اس کا جواب تحریر کر دے۔ جیسے کہ "صلاۃالوسطیٰ، یا القرء یا مَن بیدہ عُقدۃ النکاح "(درمیانی نماز، قروء، نکاح کا اختیار کس کے پاس ہے) کے بارے میں سوال ہو؛ اور اگر سوال احکامی مسائل کے بارے میں نہیں ہے جیسے کہ "رقیم، نقیر، قِطمیر یا غِسلین" کے بارے میں سوال ہو تو ایسی صورت میں یہ مسئلہ مفتی کسی مفسر کے حوالے کر دے، یا اس عالم کی طرف اس مسئلہ کو بھیج دے جو خود کو مفسر کے منصب پر فائز سمجھتا ہو۔ اور اگر زبانی جواب دے دے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات بھی نہیں ہے۔ یہ صیمری اور خطیب کا کلام ہے۔

اگر یہ کہا جائے: کہ ایسا فقیہ جو تفسیر سے بھی معرفت رکھتا ہے وہ اس مسئلہ کا جواب لکھ دے تو یہ بھی اچھا ہے کیونکہ تفسیر کے عمومی مسائل اور احکامی مسائل میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

مستفتی کے لیے آداب و أحکام اور طریقہ کار

اس کے تحت مندرجہ ذیل مسائل زیر بحث ہوں گے:

اول: مستفتی کے لیے طریقہ کار:

ہر وہ شخص جو مفتی کے درجہ پر نہیں ہے وہ درپیش شرعی مسئلہ کے متعلق مفتی سے بحیثیت مقلد سوال کر سکتا ہے۔ تقلید کے متعلق راجح نظریہ یہ ہے کہ "خطأ کے امکان کے باوجود کسی شخص کے قول کو بلا حجت قبول کرنا، خاص طور پر اس مسئلہ میں جس کے متعلق سوال کیا جارہا ہے" تقلید ہے۔

کسی بھی درپیش مسئلہ جس کے حکم کے بارے میں علم ہونا ضروری ہے میں فتوی طلب کرنا واجب ہے۔ اگر اسے اپنے علاقے میں کوئی مفتی نہ ملے تو اسے فتویٰ طلب کرنے کے لیے صاحب فتویٰ شخصیت کی طرف رختِ سفر باندھنا ہو گا، اگرچہ مفتی کا گھر کافی دور ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ سلف صالحین میں سے ایک خلقِ کثیر نے محض ایک مسئلہ کے حل کے لیے کئی دن رات کا سفر طے کیا ہے۔

دوم: اگر مستفتی مفتی کی اہلیتِ فتوی سے بے خبر ہے تو اس کے لیے قطعی طور پر ضروری ہے کہ وہ مفتی کی اہلیت معلوم کرے۔

جو شخص علم کی طرف منسوب ہو یا تدریس و تعلیم وغیرہ کے مناصب پر فائز ہو ایسے حضرات کے محض علم کی طرف منسوب ہونے یا مناصب پر فائز ہونے کی وجہ سے فتویٰ

طلب کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ جس کی اہلیت کی خبر معروف ہے اس سے فتویٰ طلب کرنا جائز ہے۔

ہمارے بعض متأخرین علماء (شوافع) فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی مشہورِ عام نہ بھی ہو تو اس کے قول: "میں فتوی دینے کی اہل ہوں" پر اعتماد کیا جائے گا۔ صرف شہرۂ عام اور تواتر پر قانع نہیں ہوا جائے گا۔ کیونکہ تواتر، شہرۂ عام اور عوام الناس میں معروف ہونا کوئی باوثوق چیز نہیں ہے۔ بعض اوقات اس کی بنیاد تلبیس (دھوکہ) پر مبنی ہوتی ہے۔ رہی بات علم یقین کی تو یہ جب تک اس کی بنیاد معلوم اور محسوس چیز پر نہ ہو مفید نہیں ہو سکتا۔

پہلی بات درست ہے کیونکہ اس کی رائے کو اپنی اہلیت کے متعلق خبر دینے کی وجہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال جس میں انسان خود اپنی توثیق کرے قابل قبول ہے۔

نیز ایسے آدمی سے بھی فتویٰ لیا جا سکتا ہے جس کی اہلیت کی توثیق معروف و مشہور لوگ کر دیں۔ شیخ ابو اسحاق (شیرازیؒ) اور دیگر کا موقف ہے کہ اہلیت کے متعلق ایک عادل عالم کی خبر بھی قابل قبول ہوگی۔

ابو عمرو فرماتے ہیں: مناسب ہے کہ خبر دینے والے عادل شخص میں یہ شرط ہو کہ وہ علم و بصیرت رکھنے والا ہو، جس کی بناء پر وہ التباس و عدمِ التباس میں فرق کر سکے، اور وہ عامۃ الناس میں سے کسی فردِ واحد کی خبر پر اعتماد نہ کرنے والا ہو، کیونکہ ان میں سے اکثر التباس سے محفوظ نہیں رہتے۔

اگر دو یا دو سے زائد اہلِ فتویٰ دستیاب ہوں تو کیا مستفتی پر ضروری ہے کہ وہ دونوں کے بارے میں اجتہاد کرے، آیا کہ دونوں میں سے بڑا عالم، زاہد اور ثقہ کون ہے؟ تاکہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف اسی موصوف کی تقلید کرے۔ اس مسئلہ کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: ضروری نہیں ہے، بلکہ وہ جس سے چاہے فتویٰ لے سکتا ہے۔ کیونکہ سارے ہی اہل ہیں، نیز ہم نے عامی سے اجتہاد کو بھی ساقط قرار دیا ہے۔ ہمارے فقہی ہم

مذہب عراقی علماء کے ہاں یہی درست رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں: کہ یہی ہمارے اکثر علماء کا موقف ہے۔

دوسری صورت: ضروری ہے؛ کیونکہ بحث و تمحیص، سوال اور مشاہدے کی بناء پر اس قدر اجتہاد کرنا تو اس کے لیے ممکن ہے۔ یہ صورت ابو العباس ابن سریج کے قول سے ماخوذ ہے۔ اسی کو قفال مروزیؒ نے اپنایا ہے اور قاضی حسین کے ہاں بھی یہی درست ہے۔

پہلوں کے احوال و اقوال کی روشنی میں بھی یہی رائے غالب تر ہے۔

ابو عمرو رحمہ اللہ کا قول ہے:

البتہ جب مفتیان میں سے ثقہ ترین کے بارے میں عامی مطلع ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ وہ اسی کی تقلید کو لازم پکڑے۔ جیسے دو دلائل میں سے راجح دلیل اور دو روایات میں سے اوثق روایت کو مقدم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر دو عالم مفتیان میں سے زیادہ ورع و تقویٰ والے مفتی کی تقلید ضروری ہوگی ہاں اگر ایک مفتی زہد و تقویٰ میں جبکہ دوسرا علم میں زیادہ ہو تو صحیح موقف یہی ہے کہ بڑے عالم کی تقلید کرنا ہوگی۔

فوت شدہ کی تقلید کے جواز میں بھی دو صورتیں ہیں:

۱۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس کی تقلید کرنا جائز ہے۔ کیونکہ فقہی مذاہب صاحب مذہب کی وفات سے فوت نہیں ہو جاتے۔ اسی لئے ان کی وفات کے بعد ان کی مذہبی آراء کو اجماع اور اختلافی مسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ گواہ کی موت اس کی گواہی کی بناء پر ہونے والے فیصلہ کے لئے مانع نہیں ہوتی، برخلاف فسق کے۔

۲۔ اہلیت کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اس کی تقلید بھی جائز نہیں۔ جیسے کہ فاسق (یعنی فسق کی وجہ سے وہ بھی شہادت دینے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے)، لیکن یہ قول ضعیف ہے، خاص طور پر موجودہ زمانے میں۔

سوم: کیا عامی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی بھی فقہی مذہب کو اختیار کر کے اس کی تقلید کر لے؟

شیخ ابو عمر و ابن الصلاح فرماتے ہیں:

پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کسی فقہی مذہب کے ساتھ وابستہ ہے یا نہیں؟ ہم اسے دو صورتوں میں تقسیم کرتے ہیں: جو کہ قاضی حسین نے ذکر کی ہیں کہ عامی شخص کا کوئی مذہب ہے یا نہیں؟

۱۔ عامی کا کوئی فقہی مذہب نہ ہو؛ کیونکہ مذہب تو دلائل کو سمجھنے والے کا ہوتا ہے، ایسی صورت میں عامی شخص حنفی و شافعی وغیرہ علماء میں سے جس سے چاہے فتویٰ لے سکتا ہے۔

۲۔ عامی کا کوئی مخصوص فقہی مذہب ہے۔ لہذا اس کے لئے اس مذہب کی مخالفت کرنا جائز نہیں ہے۔ قفال مروزیؒ کے ہاں یہی صحیح صورت ہے۔

ہم نے مفتی منتسب کے بارے میں ذکر کر دیا ہے کہ وہ کس قدر اپنے امام سے اختلاف کر سکتا ہے۔ اور اگر مفتی منتسب نہیں ہے تو دو صورتیں ہو سکتی ہیں، جنہیں ابن برہان نے بیان کیا ہے: کہ کیا عامی لے لئے ضروری ہے کہ کسی متعین فقہی مذہب کو اس کی رخصتوں اور عزیمتوں سمیت اختیار کرے؟

پہلی صورت: عصرِ اوّل کی طرح اب بھی ضروری نہیں کہ کسی معیّن عالم کی تقلید کی جائے۔ لہذا اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی سے بھی فتویٰ لے لے، یا اشد (سخت) اور اصحّ (صحیح ترین) فقہی مذہب کی جستجو کرے تا کہ اس کی تقلید کر سکے؟ مفتیان میں سے اعلم و اَوثق کی تلاش کے بارہ میں گزشتہ کی طرح یہاں بھی دو وجوہ ہیں۔

دوسری صورت: لازم ہے کہ کسی متعین مذہب کو اختیار کرے۔ اسے ابوالحسن الکیا نے بیان ہے۔ یہ قاعدہ ان تمام فقہاء و اصحابِ علوم کے لئے جاری ہوتا ہے جو درجہ اجتہاد پر فائز نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی مذہب کی اتباع و اختیار کی اجازت دے دی جائے تو اتباع کرنے والے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اس فقہی مذہب کی

رخصتوں کو ہی لیں گے۔ چنانچہ وہ حلال و حرام اور وجوب و جواز میں اپنا من چاہا حکم اپنائیں گے۔ یوں بر خلاف عصرِ اول کے احکامِ شرعیہ میں غیر مکلّف ہو جائیں گے۔ کیونکہ عصرِ اول میں پیش آمدہ واقعات کے احکام کے حوالے سے فقہی مذاہب زیادہ مہذب نہ تھے۔ اس لئے لازم ہے کہ کسی متعین فقہی مذہب کو اختیار کرنے کے لئے خوب جد و جہد کرے۔ ہم بطور تمہید ایک راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جس پر چلتے ہوئے اس کے لیے اجتہاد آسان ہو جائے گا۔

ہمارا کہنا ہے کہ:

اول: اس معاملے میں وہ محض اپنی خواہشِ نفس اور آباء و اجداد کے میلان کی اتباع کرے نہ ائمہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین میں سے کسی کے مذہب کو اختیار کرے، اگرچہ صحابہ کرام بعد میں آنے والوں کے مقابلے میں سب سے بڑے عالم اور بلند درجہ ہیں، لیکن یہ حضرات علم کی تدوین اور اصول و فروع کو ضبط کرنے میں مشغول نہ ہوئے تھے نہ ہی ان میں سے کسی کا کوئی تحریر شدہ مرتب اور مقرر فقہی مذہب تھا۔ صحابہ و تابعین کے فقہی مذاہب کی جمع و تدوین کرنے والے افراد بعد میں میدانِ عمل میں آئے، جنہوں نے واقعات کے وقوع سے قبل ہی ان سے متعلق احکامات کی بنیاد رکھی۔ نیز یہ حضرات اصول و فروع کی وضاحت کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ جیسے کہ امام مالک اور ابو حنیفہ رحمہما اللہ وغیرہ۔

امام شافعیؒ جو ان آئمہ سے بہ اعتبارِ زمانہ متاخر ہیں، انہوں نے ان کے مذاہب پر غور و خوض کیا جیسے انہوں نے اپنے سے پہلوں کے مذاہب پر غور کیا تھا۔ لہذا امام شافعیؒ نے ان کی تحقیق و تدوین کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر نقد بھی کیا اور ان میں سے راجح ترین کا انتخاب بھی کیا۔ امام شافعی نے اپنے سے پہلے علماء کے بارے میں یہ بات پائی کہ انہوں نے مسائل کی عکس بندی اور منظر کشی کے حوالے سے بقدرِ کفایت محنت کی ہے۔ لہذا آپ مذاہبِ فقہیہ کے علوم میں کمالِ معرفت و مہارت اور اپنے سے پہلوں پر

سبقت کی وجہ سے مسائل میں اختیار و ترجیح اور تکمیل و تنقیح کے لئے یکسو ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے اس مقام پر آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آپ کا مذہب اتباع و تقلید کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے، کیونکہ وضوح، انصاف اور دیگر آئمہ پر عدم جرح اس مذہب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اگر عامی شخص تھوڑا غور و خوض کرے تو امام شافعی کے فقہی مذہب کو ہی اختیار کرے گا۔

چہارم: جب دو مفتی صاحبان کے فتاویٰ ایک دوسرے سے مختلف ہوں:

اس کی علماء کے ہاں پانچ صورتیں ہیں:

۱۔ مفتی دونوں میں سے زیادہ سخت فتویٰ کو اختیار کرے۔

۲۔ دونوں میں سے زیادہ آسان فتویٰ کو اختیار کرے۔

۳۔ راجح فتویٰ کے متعلق اجتہاد کرے، بڑے عالم و زاہد کے فتویٰ کو اختیار کرے جس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ اسے امام سمعانی کبیرؒ[1] نے اختیار کیا ہے۔ امام شافعیؒ نے قبلہ کی تعیین کے متعلق اسی کی مثل نص ذکر کی ہے۔

۴۔ کسی تیسرے مفتی سے بھی فتویٰ لے اور گزشتہ دونوں مختلف فتاویٰ میں سے جس کے موافق یہ فتویٰ ہو اسے اختیار کر لے۔

۵۔ مفتی کو اختیار ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار کر لے۔ مصنف ابو اسحاق شیرازی اور خطیب بغدادی کے ہاں یہی درست صورت ہے۔ اسے محاملی نے "المجموع" کے آغاز میں ہمارے بیشتر اصحاب سے نقل کیا ہے۔ صاحبِ "الشامل" نے "اذاتساوی المفتیان فی نفسہ" میں اسی صورت کو اپنایا ہے۔

شیخ ابو عمروؒ نے اس صورت کو اختیار کیا ہے کہ مفتی راجح ترین فتویٰ کے متعلق تفتیش کرے پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ چونکہ یہ باہم متعارض فتاویٰ ہیں اس لئے

---

1 اصلی قلمی نسخہ میں ہے: "انہوں نے امام کبیر اس لئے کہا تاکہ وہم نہ ہو کہ یہ ابو سعید سمعانی ہیں"۔ اھ۔

مفتی ان مفتیان میں سے اوثق کو تلاش کرے اور اس کے فتویٰ پر عمل پیرا ہو۔ اور اگر دونوں مفتیان میں وہ ترجیح نہیں دے پاتا تو کسی تیسرے مفتی کی طرف رجوع کرے۔ اس کا فتویٰ جس کے موافق ہو اسی کو راجح سمجھے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو اور فتویٰ میں حرمت اور اباحت کا اختلاف ہو تو اسے تحریم کو اختیار کرنا چاہیے، یہی زیادہ محتاط ہے۔

اگر ہر اعتبار سے دونوں فتوے برابر ہوں تو ہم اس کو اختیار دیں گے کہ جس پر چاہے عمل کرلے، اگرچہ ہم دیگر صورتوں میں اختیار نہیں دیتے، لیکن یہاں ضرورت ہے۔ اور ایسا بہت نادر صورت میں ہوتا ہے۔

شیخ ابو عمرو ابن الصلاح فرماتے ہیں: ہم نے جواب تک جو ذکر کیا ہے اس میں ہم دو مفتیوں سے مخاطب تھے، رہا عامی شخص جسے یہ صورتِ حال درپیش ہو تو اس کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ ان دونوں مفتیوں سے یا کسی دوسرے مفتی سے سوال کرے۔ ہم نے مفتی کی رہنمائی کردی ہے کہ ایسی صورت میں وہ کیسے جواب دے۔

اس موقف کو شیخ ابن صلاح نے اپنایا ہے جو قوی و مضبوط نہیں ہے۔ تیسرا، چوتھا اور پانچواں ان تین میں سے ایک موقف ہی زیادہ ظاہر ہے۔ بظاہر پانچواں موقف سب سے غالب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ سائل اہلِ اجتہاد میں سے نہیں ہے۔ بلکہ اس پر تو لازم یہ ہے کہ وہ ایسے عالم کی تقلید کرے جو اہلِ اجتہاد میں سے ہو۔ البتہ دو مفتیان میں سے کسی ایک کے قول کو چن کر اس نے اجتہاد کے فعل کو سرانجام دیا ہے۔ مذکورہ موقف اور اس موقف جس میں قبلہ کے بارے میں نص ذکر کی گئی ہے فرق یہ ہے کہ قبلہ کے بارے میں علامات حسی ہیں۔ ایسی صورت میں درستی کو پانا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں دونوں مجتہدین کے درمیان تفاوت بالکل عیاں ہے۔ کیونکہ فتاویٰ کی علامات معنوی ہوتی ہیں۔ لہٰذا دو مجتہدین میں کوئی بڑا تفاوت ظاہر نہیں ہوتا۔

پنجم: خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

اگر کسی علاقہ میں فتویٰ دینے والی شخصیت صرف ایک ہی ہو اور وہ کسی مسئلہ کے بارے میں فتویٰ دے تو اس کے فتویٰ پر عمل کرنا لازم ہو گا۔

ابو المظفر سمعانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کہ جب مستفتی مفتی کا جواب سن لے تو اس پر اس فتویٰ کے مطابق عمل پیرا ہونا ضروری نہیں ہے الا یہ کہ وہ اس کا مقلد ہو۔

مزید فرماتے ہیں: جائز ہے کہ اس سے یہ کہا جائے کہ وہ اس مسئلہ پر عمل کرنے میں اسی فتویٰ کو لازم پکڑے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مستفتی کو جب یہ مسئلہ یقینی طور پر درست لگے تو اس کو اسے ضرور اختیار کرنا چاہیے۔ سمعانی نے اسے سب سے اولیٰ موقف قرار دیا ہے۔

شیخ ابو عمرو فرماتے ہیں: کہ میں نے اس صورت کو اس کے علاوہ کے لیے نہیں پایا۔ اس کے بعد انہوں نے بعض اصولیوں سے اس بات کو نقل کیا ہے کہ جب مفتی کسی ایسے مسئلہ کے بارے میں فتویٰ دے جس میں اختلاف کیا جاتا ہے تو مستفتی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اس سے یا اس کے علاوہ کسی سے بھی فتویٰ لے لے۔ پھر انہوں نے اس موقف کو بھی اختیار کیا ہے کہ عامی پر لازم ہے کہ وہ دو مفتیوں میں سے کسی ایک مفتی کو متعین کرنے کے بارے میں اجتہاد کرے۔ لہذا پھر اس پر لازم ہو گا اس مفتی کے فتویٰ کو اختیار کرنا جسے اس نے اپنے اجتہاد سے منتخب کیا ہے۔

شیخ ابو عمرو کہتے ہیں: چند مسائل؛ قواعد متقاضی ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کی جائے:
جب مفتی سائل کو فتویٰ دے تو وہ دیکھے، اگر اسے اس صاحبِ فتویٰ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ملتا: تو اسی کے فتویٰ کو اختیار کرنا ضروری ہو گا۔ اس کو تقلید کے ساتھ خاص نہیں کیا جائے گا، نہ اس خاص مسئلہ میں نہ دیگر مسائل میں۔

اور اگر دوسرا مفتی مل جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ وہ بڑا ثقہ عالم ہے تو اس کے فتوے کو لازم پکڑے کیونکہ یہی موزوں ترین ہے جیسے کہ مفتی کے تعین سے متعلقہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اور اگر اس کا ثقہ و اَعلم ہونا واضح نہ ہو تو محض فتویٰ دینے کی بنا پر مستفتی

پر اس کے فتویٰ کو اختیار کرنا ضروری نہیں ہو گا۔ اس صورت میں اس مفتی کے علاوہ دوسرے مفتی سے فتویٰ طلب کرنا اور اس کی تقلید کرنا جائز ہو گا، اور اگر یہ ہو کہ فتویٰ میں دونوں کے متفق ہونے کا پہلے علم نہیں تھا، اب اگر اسے دونوں کا فتوے میں متفق ہونا معلوم ہو گیا ہے یا حاکم نے اس فتوے کے مطابق حکم دیا ہے تب بھی اس فتوے پر عمل لازم ہو گا۔

ششم: اگر کسی واقعہ میں مستفتی کے طلب کرنے پر اسے فتویٰ مل گیا پھر یہی حادثہ اس کے ساتھ دوبارہ رونما ہوا، تو کیا اس مسئلہ میں دوبارہ سوال کرنا اس کے لیے ضروری ہے؟

اس میں دو صورتیں ہیں:

ا۔ ہو سکتا ہے کہ مفتی کی پہلے والی رائے تبدیل ہو گئی ہو اس لیے دوبارہ فتوی لینا لازم ہو گا۔

۲۔ لازم نہیں ہے۔ اور یہی موقف درست ہے۔[1] کیونکہ اسے پہلے حکم کا علم ہے۔ اصل یہی ہے کہ پہلے سے موجود فتوی پر ہی اکتفاء کیا جائے۔

---

1 اصل خطی نسخہ کے حاشیہ میں ہے: "قاضی ابو طیب باب استقبال القبلۃ کے آخر میں تعلیق تحریر کرتے ہوئے عامی کا ذکر کرتے ہیں کہ اسے کوئی حادثہ پیش آئے اور وہ اس کے بارے سوال کرے، پھر دوبارہ وہی مسئلہ درپیش ہو تو صحیح رائے کے مطابق دوسری مرتبہ بھی سوال کرنا لازم ہے۔ البتہ اگر مسئلہ بار بار پیش آنے والا ہے اور بار بار سوال کرنا بھی دشوار ہے تو پھر ہر بار فتوی لینا ضروری نہیں ہے، اور مشقت کی وجہ سے پہلی بار سوال ہی کافی ہے۔ یہ برخلاف ہے جن دو چیزوں کا ذکر ہم یہاں کر رہے ہیں:

اول: مسئلہ کے کثرتِ وقوع کی وجہ سے یہ استثنائی صورت ہے۔ اور شیخ نے بھی اسے برقرار رکھا ہے۔

دوم: ترجیح میں اختلاف ہے۔ انتھی"۔ اھ

صاحبِ "الشامل" نے اس اختلاف کو اس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جب زندہ کی تقلید کی جا رہی ہو اور وہ مسئلہ مرنے والے کی طرف سے خبر دیا جا رہا ہو تو اس صورت میں بار بار سوال کرنا لازمی نہیں ہے۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ اس کو کسی صورت کے ساتھ خاص نہیں کیا جائے گا کیونکہ مفتی فوت شدہ کے فقہی مذہب پر ہی ہوتا ہے۔ بہت کم اس کے مذہب کے مطابق جواب میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے۔

ہفتم: مستفتی کو چاہیے کہ بذات خود فتویٰ طلب کرے اور وہ کسی قابل اعتماد شخص کو بھیج کر بھی فتوی طلب کر سکتا ہے۔ فتوی لے کر آنے والا جب خبر دے کہ یہ مفتی کی لکھی ہوئی تحریر ہے، یا یہ خود مفتی کی تحریر کو پہچانتا ہو تو اسے اس بات میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ اسی مفتی کی تحریر ہے۔

ہشتم: مستفتی کو چاہیے کہ وہ مفتی کے ساتھ ادب سے پیش آئے۔ اس کو مخاطب کرنے اور جواب وغیرہ دینے میں اس کی تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھے۔ اس کے سامنے ہاتھوں کے ساتھ اشارے نہ کرے، نہ یہ کہے: کہ آپ کو اس مسئلے میں کیا یاد ہے؟ یا اس مسئلے میں آپ کے امام یا امام شافعیؒ کا کیا مذہب ہے؟ نہ ہی اس کے جواب پر یہ کہے: کہ میرا بھی یہی کہنا ہے یا مجھے بھی ایسے ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسا بھی نہیں کہنا چاہیے: مجھے فلاں نے ایسا ہی فتویٰ دیا ہے یا آپ کے علاوہ سے بھی یہی فتویٰ ملا ہے۔ ایسا کہنا بھی درست نہیں: کہ اگر آپ کا جواب اس لکھے ہوئے فتویٰ کے مطابق ہے تو آپ بھی فتویٰ لکھیں ورنہ رہنے دیں۔ اسی طرح مفتی کے کھڑے ہونے، مصروفیت، غصہ اور پریشانی وغیرہ جیسی کیفیت میں جب دل و دماغ حاضر نہ ہوں، سوال نہ کرے۔

اگر مستفتی ایک ہی ورق پر دو مفتیوں کے جوابات لکھوانا چاہتا ہے تو مناسب یہ ہے کہ مرتبے اور علم میں بڑے عالم مفتی سے ابتدا کرے۔ پھر اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے جواب لکھوائے۔ البتہ اگر مستفتی الگ الگ کاغذ پر جواب لیتا ہے تو پھر جس سے چاہے ابتدا کر سکتا ہے۔ کاغذ اس قدر بڑا ہونا چاہیے کہ مفتی اس پر اپنا مکمل اور واضح جواب

تحریر کر سکے، اسے اختصار نہ کرنا پڑے اور آخر میں مستفتی کے لیے دعائیہ کلمات لکھنا بھی نہ بھولے۔

صیمری کا قول ہے کہ اگر مستفتی ایک مفتی صاحب سے فتویٰ لے رہا ہے تو اسے یہ کہنا چاہیے: "اللہ آپ پر رحمت کرے یا اللہ آپ سے راضی ہو، یا اللہ آپ کو توفیق دے اور سیدھا رکھے اور آپ کے والدین سے راضی ہو، آپ اس مسئلے میں کیا کہتے ہیں؟" البتہ یہ کہنا کہ: "اللہ تعالیٰ ہم پر اور آپ پر رحمت فرمائے" اچھا نہیں ہے۔

ہاں اگر وہ زیادہ مفتیوں سے وہ جواب لینا چاہ رہا ہے تو یوں کہے: "اللہ آپ سب سے راضی ہو اس مسئلہ میں آپ سب کیا فتویٰ دیتے ہیں؟" یا فقہاء اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں: "اللہ سب پر رحمت فرمائے۔"

مفتی کو مستفتی کاغذ کھول کر پکڑائے اور کھلا ہوا ہی وصول کرے تاکہ اسے کھولنے پابند کرنے کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نہم: مناسب یہ ہے کہ کاغذ پر تحریر لکھنے والا ماہر ہو، اس کا خط خوبصورت ہو تاکہ وہ مقصود کو واضح خط و تلفظ میں تحریر کرے اور تاکہ عبارت تصحیف و تحریف سے محفوظ رہے۔

صیمری کہتے ہیں: مستفتی کو اس بات کا حریص ہونا چاہیئے کہ وہ اپنا سوال اہلِ علم کاتب سے تحریر کروائے۔ بعض فقہاء جن کے پاس کوئی عہدہ ہوتا ہے اس قدر محتاط ہوتے ہیں کہ وہ اپنا جواب صرف اسی کاغذ پر تحریر کرتے ہیں جسے شہر کی کسی عالم شخصیت نے تحریر کیا ہو۔

عامی کو چاہیے کہ وہ مفتی سے دلیل طلب نہ کرے اور نہ ہی یہ کہے کہ آپ نے ایسا کیوں فرمایا ہے؟ اگر وہ اپنے دل کی تسکین کے لئے دلیل سننا چاہتا ہے تو کسی دوسری مجلس میں یا اس مجلس کے برخاست ہونے کے بعد دلیل طلب کرے۔ مجلس میں محض فتویٰ کو قبول کرے۔

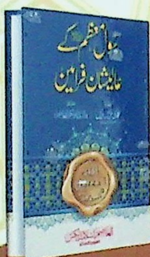
امام سمعانیؒ کہتے ہیں: کہ دلیل طلب کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ مفتی کو اپنے فتوے کی دلیل ذکر کرنی چاہیے اگر وہ قطعی ہے۔ البتہ اگر قطعی نہیں ہے، تو پھر دلیل ذکر نہ کرے، کیونکہ ممکن ہے کہ دلیل اجتہاد کی متقاضی ہو اور عامی اس کی دلیل سمجھنے سے قاصر رہے۔ پہلی بات ہی درست ہے۔

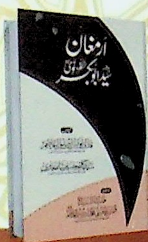
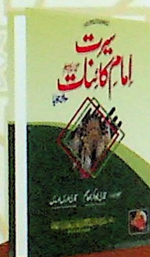
دہم: صاحب واقعہ یعنی جسے حادثہ پیش آیا ہے اگر وہ اپنے علاقہ یا کسی دوسرے علاقہ میں مفتی پائے نہ ہی کسی ایسے عالم کو پائے جو اس کے لئے مسئلے کا حکم نقل کر سکے۔

شیخ ابو عمرو ابن صلاحؒ کہتے ہیں: کہ یہ اصولی طور پر فترۂ شریعت (نزولِ شریعت سے پہلے کے دور) کا مسئلہ ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو شریعت کے نزول سے پہلے کا ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال میں بندہ مکلف نہیں ہوتا۔ اس پر وجوب کا حکم ہو گا نہ حرمت کا، اور نہ ہی کوئی اور حکم۔ لہٰذا صاحب واقعہ اس مسئلہ میں جو بھی عمل کرے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔ واللہ اعلم۔







حاملین قرآن
کے اوصاف

ارمغان
سیدابوبکر

سیرت
امام کائنات

منزل
مستند وظائف

